لکھنؤ

تعمیر حیات

پندرہ روزہ

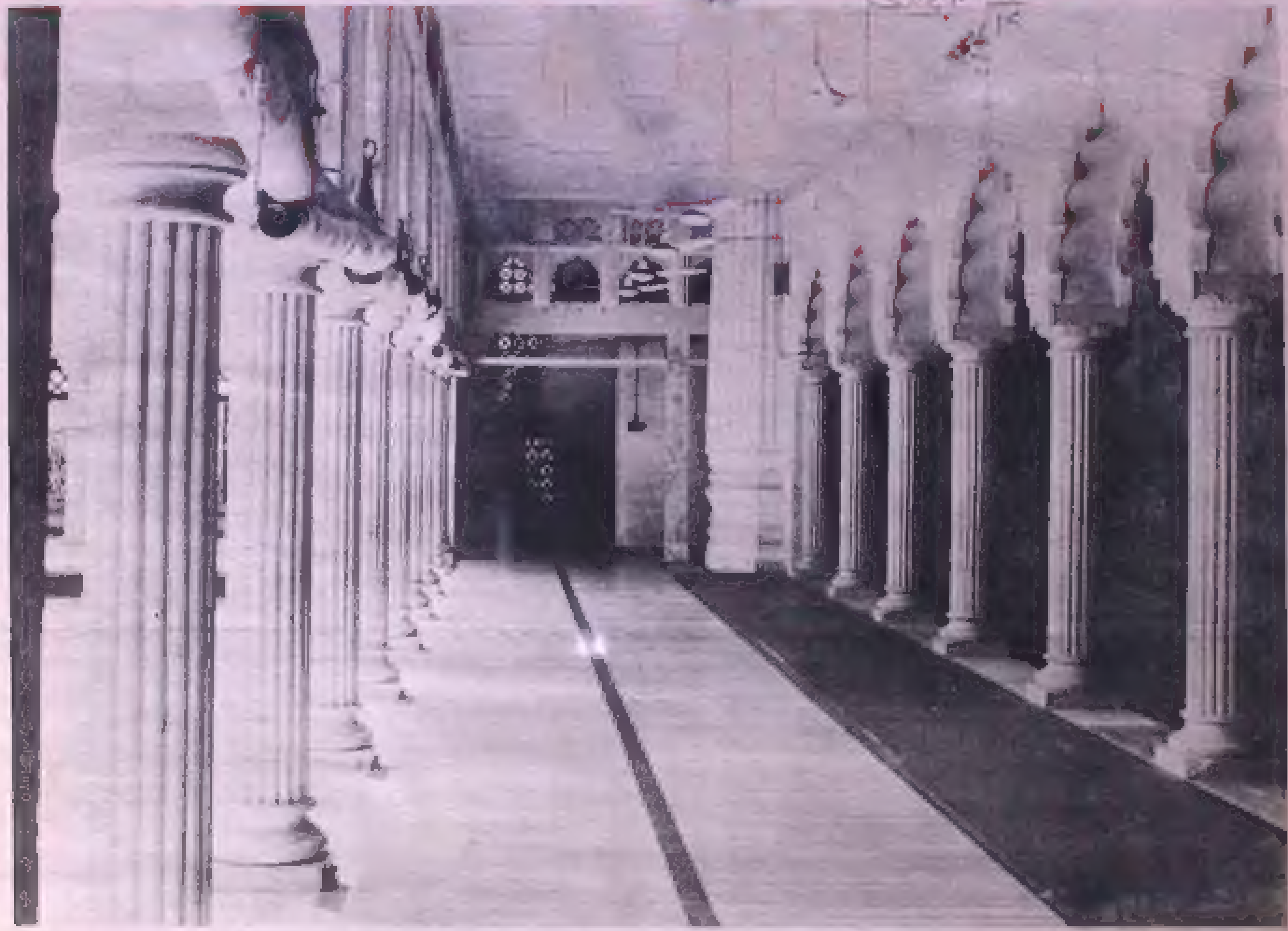

کیا امتِ اسلامیہ ایک بے مقصد قوم ہے؟

ڈاکٹر عبدالملک الیاسی والمدنی

★

کیا واقعی امت اسلامیہ ایک بے مقصد قوم ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس کو بے کار وعبث پیدا فرمایا ہے؟ حاشا وکلا، اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات اس سے بری ہے کہ وہ کسی کو بے مقصد پیدا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے جن وبشر دونوں کو پیدا فرمایا، عبادت اور اطاعت کے لئے اور ہر زمانہ میں نبی بھیجے ان کو لائحۂ عمل بتانے کے لئے ان کا مقصد یہی تھا کہ نیکوکار نیکوکاری کے ذریعہ اللہ کو راضی کریں، آپس میں ایک دوسرے کو بھلائی کی تلقین کرتے رہیں، ساری امم سابقہ کا یہی مقصد حیات تھا مگر نبوت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ختم ہوگئی آپ خاتم الانبیاء ہیں سید المرسلین ہیں، سارے نبیوں کے امام سارے پیغمبروں کے سردار، اور جس طرح حضور کو یہ شرف بخشا گیا اسی طرح ان کے غلاموں کو بھی عزت کا تاج پہنایا گیا، ان کی امت ساری امتوں کی سردار قرار دی گئی، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سابقین کی طرح کسی محدود زمانے اور کسی معین علاقہ کے لئے نہیں بھیجے گئے، ان کا زمانہ بھی لامحدود اور ان کی زمین بھی لامحدود، ان کی نبوت قیامت تک قائم ہے لیکن ان کا ظاہری وجود صرف ۶۳ سال ہی کے لئے تھا، باقی ساری ملت کے لئے اور ساری زمین کے لئے ان کی امت ان کی قائم مقام ہے، فرمایا "کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتؤمنون باللہ" تم سب سے افضل امت ہو تمہاری صفت خاص یہ ہے کہ تم لوگوں کی (دنیا) کی نفع رسانی کے لئے پیدا کئے گئے ہو، لوگوں کو بھلائی کی طرف بلاتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو اور اللہ کی ذات پر یقین وایمان رکھتے ہو" نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج بھی سب فرض ہیں، دین کا ستون ہیں، مگر پہلی امتوں کے لئے ان کی انجام دہی مقصود وحید تھی لیکن اس امت کے لئے ان کا درجہ وضو کا ہے اور دعوت الی اللہ کا درجہ نماز کا، وضو نماز کے لئے کیا جاتا ہے، خالی وضو کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی اگرچہ وضو بجو نماز اور تقرب الی اللہ کے لئے کیا جائے سارے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔ لیکن جب اصل مقصود سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو تو اندیشہ ہے یہ وضو خود عذاب نہ بن جائے۔ یہی حال ہماری عبادت کا ہے اب جب کہ نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے، اور گمراہی وضلالت کا بازار جو سے کا تو گرم ہے سارے ذمہ داری امت مسلمہ کے کندھوں پر آ جاتی ہے اس لئے کہ یہ خیرِ امم بنائی گئی ہے، خیر الامم ہے، افضل الملل ہے، سر پر سرداری کا تاج رکھا گیا ہے کوئی منصب عالی ذمہ داری سے خالی نہیں ہوتا، درجہ اور مرتبہ جتنا بلند ہوگا اتنی ہی ذمہ داری عظیم ہو گی۔

"جن کے رتبے ہیں سوا انکو سوا مشکل ہے"

اس آیت شریفہ کے سلسلہ میں ایک مشہور مفسر کہتا ہے:۔

"جس طرح خدا کی ہدایت ہم تک پہنچانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری بڑی سخت تھی حتیٰ کہ اگر وہ اس میں ذرہ بھی کوتاہی بھی کرتے تو خدا کے ہاں ماخوذ ہوتے اسی طرح دنیا کے عام انسانوں تک اسی ہدایت کو پہنچانے کی نہایت سخت ذمہ داری ہم پر عاید ہوتی ہے"

اس سلسلہ کی دوسری آیت وکذلک جعلنٰکم امۃ وسطًا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا (ہم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں گے) کے معنی یہ ہیں کہ رسول کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عام انسانوں پر گواہی کی حیثیت سے اٹھنا ہوگا اور یہ شہادت دینی ہو گی کہ رسول نے جو کچھ تمہیں پہنچایا تھا وہ تم نے انھیں پہنچانے میں اور جو کچھ رسول نے تمہیں دکھایا تھا وہ تم نے انھیں دکھانے میں اپنی حد تک کوئی کوتاہی نہیں کی"

شیخ التفسیر خواجہ عبدالحی الفرقانی ان دونوں آیتوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:
"ان دونوں چیزوں کو پیش نظر رکھ کر ہر مسلم کا مقصد حیات خود بخود معلوم ہو جاتا ہے اور وہ یہی ہے کہ وہ قرآن حکیم کو اپنے ہاتھ میں لے اور اس کی نشر واشاعت میں سرگرم کوشش کرے، دنیا کا ایک ایک کونہ چھان مارے اور کوئی امت (انسانی) ایسا نہ رہ جائے جس میں اس نے اسلام کی تبلیغ نہ کی ہو"۔

اصل چیز مقصد پہچان لینا ہے پہلی بات تو یہ کہ ہم بے مقصد آوارہ پیدا نہیں کئے گئے ہیں بلکہ ہمیں مقصد دیا گیا ہے ہم مقصد کے ساتھ پیدا کئے گئے ہیں، اور مقصد بھی اتنا بلند کہ اس سے بلند کوئی مقصد ہو ہی نہیں سکتا ہے، یہ وہی پیغمبرانہ کام ہے، منزل انسانوں کی ساری جس کی گرد راہ ہوں وہ کہکشاں تجھے اور وہ کام ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کام کی تکمیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ۲۳ سال کے عرصہ میں پورے عرب کو جہنم سے نکال کر جنت کے راستے پر ڈال کر، محنت وکوشش عزم واستقلال اور صبر واستقامت کا ایک نمونہ قائم کر دیا، اس کے بعد سارے عالم اور سارے زمانوں کے لئے یہ کام امت کے حوالہ کر دیا گیا، یہی اس کا مقصد حیات ہے۔

جب یہ مقصد حیات ہمارے اندر زندہ تھا تو ہم دنیا کی قیادت کر رہے تھے ہم میں غیرت بھی تھی، حمیت بھی تھی، شجاعت بھی تھی، سخاوت بھی تھی، ایثار بھی تھا قربانی بھی تھی اخلاقیات بھی تھی، ایمانی فراست بھی تھی لیکن جب دل سے یہ شعور کم ہوا، اور یہ جذبہ مستور ہو ساری برائیاں ہم میں پیدا ہوگئیں، ہم انسانیت کے چہرہ پر ایک بدنما داغ بن گئے اور قانون قدرت کے مطابق اہل انکار کے ہاتھوں میں ہماری قیادت سونپ دی گئی آج ہر جگہ ہم آزاد ہوں یا غلام، فقیر ہوں یا بادشاہ کفر کی قیادت میں چل رہے ہیں، جلالۃ الملک ہوں یا شہنشاہ، صدر جمہوریہ اسلامیہ ہوں یا رئیس الوزراء جمہوریہ سب کی لگام جہنم والوں کے ہاتھ میں ہے اور وہ علی الاعلان جہنم کی طرف لے جا رہے ہیں۔ "فاعتبروا یا اولی الابصار"

ذرا ملاحظہ فرمائیں، اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہندوستان میں ایک ہزار سال وسائل کا مرکز کے ساتھ کیا یہ عرصہ کم تھا اس ملک کے جہنم کو جنت بنا دینے کے لئے، ایک ہزار برس، معمولی بات ہے، ساری آبادی کو دوزخ سے نکال کر فردوس بریں کی راہ پر لے آتے، سچ بتائیے کیا ہم نے حق ادا کیا اس ملک کا؟ اپنے رعایا کا، جنہوں نے بالکلیہ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دیا تھا، غور کرو قیامت میں کیا جواب دیا جائے گا، جب ان کی جانب سے ہم پر مقدمہ قائم ہوگا ایسی حالت میں کیا ہماری یہی جنت باقی رہ جائے گی؟

اسپین میں سات سو سال دئے گئے اس کی زمین کو تو بے شک ہم نے جنت بنا دیا تھا، مگر امت کے ساکنین کی روحوں کو جہنم سے نکالنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی انہیں دوزخ میں جاتے ہوئے دیکھتے رہے اور پرواہ نہ کی، ایسی قوم بخشی جا سکتی ہے اسپین کی ہدایت کے لئے یہ مدت کافی سے زیادہ تھی، اس عرصہ میں پورا یورپ خلد بریں کے دائرہ میں آ سکتا تھا جس سے کشش دنیا بڑھ دی گئی، ساری دنیا کو اسلام کا پیغام پہنچا سکتی تھی، آج امریکہ بھی سارا خوش بخت وخوش انجام ہوتا مگر وائے بدحالی! مدت بھی ہمیں بہت دی گئی، وسائل بھی بیشمار دئے گئے۔

"بجز بازی نگاہ تھا کے سفینوں کا کبھی"

مگر ہماری بے مقصدی نے ہمارا بھانڈا پھوڑا دولت وحکومت مقصود اصلی اور دنیا بخت ہمارے لئے عرش الٰہی بن گئے۔ نتیجہ جو ہونا تھا وہی ہوا سارے وسائل چھین لئے گئے، دنیا میں ذلیل کر دئے گئے۔

"ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں"

وجہ صاف ظاہر ہے ہمارا مقصد حیات ساری دنیا کو جہنم سے نکال کر جنت میں لانا تھا اس میں غفلت برتی، ذلت کے گڑھے میں پھینک دئے گئے، بہر حال ہمیں زندگی صرف اس غرض سے دی گئی ہے کہ ہم ساری دنیا کو جہنم سے نکال کر جنت میں لائیں یہی کام حضور کا تھا یہی کام ہمارا ہے، اسی کا ہمیں حکم دیا گیا تھا، پورا قرآن ہمیں بتلا رہا تھا،

"بلغوا عنی ولو آیۃ"
(میری جانب سے پہنچاؤ ایک آیت ہی ہو)

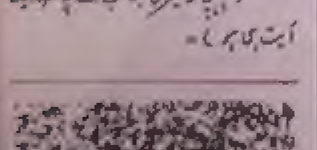

لکھنؤ

تعمیرِ حیات

پندرہ روزہ

شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد ۱۵ | ۱۰ جولائی ۱۹۷۸ء — ۴ شعبان المعظم ۱۳۹۸ھ | شمارہ ۱۷

نامہ تعمیر حیات ہندوستان میں بذریعہ محصول ڈاک:
سالانہ: ۱۲ روپے ششماہی سات روپے
فی پرچہ ۶۰ پیسے
بیرون ہند بذریعہ محصول ڈاک:
بحری ڈاک سے: ایک پاؤنڈ دس شلنگ
ہوائی ڈاک سے: امریکہ و کناڈا ۱۰ ڈالر
یورپی ممالک: ۳ پونڈ
افریقہ، مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے ممالک ۲½ پونڈ
پاکستان: ۳۰ روپے
بنگلہ دیش: ۱۰ روپے

اگست جلیس ندوی سے

پیشہ اور تفریحی شغلہ

دار العلوم ندوہ کے طلبہ کی یونین جمعیۃ الاصلاح میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور کل ہند مسلم مجلس مشاورت کے اراکین کے استقبالیہ جلسے میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے جو تقریر فرمائی تھی وہ تعمیر حیات شمارہ ۱۲ میں قارئین کی نظر سے گذر چکی ہوگی۔

مولانا موصوف نے اس تقریر میں بڑے درد اور خلوص سے فرمایا تھا کہ مسلمان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ ایک نعرے پر دیوانہ ہو جاتا ہے، اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے، وہ نعرہ کیوں لگایا جائے جس سے مسلمان پر جنون کا دورہ پڑے۔ وہ اپنا توازن کھو بیٹھے۔ نعروں کا زمانہ گیا، میں صفائی کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپ تعمیری کام کرنے والوں کو دس برس کی مہلت دیدیجئے اور قوم کو اشتعال، جذباتیت اور سیاسی ہنگامہ آرائی کے دھارے میں نہ بہائیے۔ افراد کو خیرات دی جاتی ہے، میں قوم کے لئے ملت کے لئے آپ سے خیرات مانگتا ہوں کہ دس برس کے لئے آپ مہلت دیدیجئے، تاکہ ہمارے غیر مسلم بھائی اور ملک کی اکثریت کا ذہنی توازن نارمل ہو جائے، ان میں معقول بات سننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے، اور مسلمانوں کا ذہن بھی طوفانی دریا کی مانند نہ ہو جائے کہ جس میں ہمارے ادارے بہہ جائیں اور صدیوں کا اثاثہ ملیامیٹ ہو جائے۔"

مولانا نے اپنی اس تقریر کے آخر میں یہ بھی فرمایا کہ:-

"آپ ملت کی کشتی کے ملاح ہیں، کوشش کیجئے کہ یہ کشتی طوفان سے الگ ہو کر ساحل مراد تک پہونچ سکے۔"

مولانا کی اس تقریر میں ہندوستان کی تقریباً تمام دینی، سیاسی، سماجی تنظیموں کے ذمہ دار موجود تھے، سامعین پر شدید تأثر کی فضا طاری تھی، ہال میں اور شبلی ہوسٹل کے لان پر فرشوں کا ہجوم تھا صرف ایک آواز گونج رہی تھی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس منتخب اور چیدہ مجمع میں کی گئی اس تقریر کو ہم ہندوستان کی ملت اسلامیہ کے لئے ایک خوشگوار موڑ، چراغ راہ اور سنگ میل سمجھتے رہے لیکن افسوس ہے کہ مسلم سیاسی جماعتوں کے سربراہ جب اس ماحول سے نکل کر اپنی فضا میں پہونچے تو اثر شاید زائل ہو چکا تھا، ہماری مثبت امیدوں اور توقعات کا شیش محل دو واقعات نے چکنا چور کر دیا، حال ہی میں جنوبی ہند کی بعض ریاستوں کے لوکل سیلف گورنمنٹ، میونسپلٹی، کارپوریشن، اور پنچایتوں کے جو انتخابات ہوئے اس میں مسلم سیاسی جماعتوں نے بھی حصہ لیا اور اپنے امیدوار کھڑے کئے، اپنے امیدواروں کی انتخابی مہم کے دوران جلسوں میں، میٹنگوں میں، جلوسوں میں وہی زبان اور لب و لہجہ استعمال کیا گیا، وہی نعرے لگائے گئے جو کسی طرح جرأت کے شایان شان نہیں تھے، وجہ صلح کی بنیادوں کو فراہم کرنے میں معاون نہیں بنتے، جو فضا کو دعوت کے حق میں سازگار بنانے کی بجائے باہمی منافرت پیدا کرتے اور خلیج وسیع کرتے ہیں، اس علاقہ کی فضا کو مکدر کر کے حاصل کیا ہوا؟ کہیں ایکا دُکا نشست اور اکثر مقامات پر صدفی صد ناکامی۔

دوسرا واقعہ ملت کے کسی بھی مسئلہ کو خلوص، سنجیدگی، حکمت و تدبر سے حل کرنے کی سعی ہر طرح محمود و مشکور ہو گی، لیکن اپنی جماعت کو زندہ رکھنے، اپنے جوشیلے کارکنوں کو مشغول کرنے، اپنی لیڈری کو چمکانے اور سستی شہرت کو حاصل کرنے کے لئے کوئی شوشہ کھڑا کرنا، جس کے پیچھے کوئی سنجیدہ پلاننگ اور مخلصانہ جذبہ نہ ہو، فتنوں کو دعوت دیتا ہے اور ملت کے مسائل کو کبھی بگاڑ دیتا ہے اور کبھی اُلجھا دیتا ہے۔

ایک مسلم سیاسی جماعت کی مہاراشٹر شاخ نے اردو کو مہاراشٹر کی دوسری سرکاری زبان بنانے کا پونہ اور بمبئی کے چوراہے پر مطالبہ کیا۔ بے سوچے سمجھے فضا میں اس نعرہ کا رد عمل یہ ہوا کہ گوپال گوڈسے اور ساورکر نے ہندو مہاسبھا کے زیر اہتمام پورا ایک ہفتہ اردو ہٹاؤ مہم منانے کا اعلان کر دیا، اشتعال انگیز تقریروں اور مسلم دشمنی کی مہم کی لپیٹ میں پورا علاقہ سلگ رہا ہے۔ اکثریت کے فرقہ پرست عناصر کی طرف سے اس رد عمل کا تو ڑ ہمارے سیاسی لیڈروں کے ذہن میں نہیں تھا، نہ اس مطالبہ میں پلاننگ اور سنجیدگی تھی، نتیجہ یہ کہ مسلم عوام غیر مسلم فرقہ پرستوں کی عتاب کی زد میں ہیں اور مسلم سیاسی لیڈر اپنی سرکاری اور نجی رہائش گاہوں میں آرام و سہولت سے براجمان ہیں۔

مسلم قومیت کی بنیاد پر اقلیت کی سیاسی صف آرائی اور برادرانِ وطن سے حریفانہ کشمکش غیر مسلم فرقہ پرست عناصر کو نئی زندگی بخش دیتی ہے۔ یہ ہمیشہ کا تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ لیکن جن لوگوں کے لئے سیاست، تفریحی شغلہ (HOBBY) اور پیشہ (PROFESSION) بن چکی ہے، انہیں ملت کے حال و مستقبل کی پروا نہیں، دو یا تین آدمی پارلیمنٹ پہونچ جائیں، کسی ریاست میں انگلیوں پر گنی جانے والی تعداد اسمبلی میں پہونچ جائے، ان چند لوگوں کی کرسیوں، الاؤنس اور لیڈری کی قیمت کروڑوں فرزندانِ توحید اور دعوت اسلامی کو چکانی پڑتی ہے، اس کا بیلنس شیٹ سنجیدگی، حقیقت پسندی، دیانت داری اور بصیرت سے تیار کیا جائے تو قوم کی آنکھیں کھل جائیں کہ چند لوگوں کے STATUS کی خاطر وہ کتنا عظیم نقصان مسلسل اٹھا رہی ہے۔

گذشتہ پچاس سال سے مریض کو خودکشی کا مشورہ دینے والے مسلم سیاسی جماعت کے رہنما، اب مزید اس نسخہ کو نہ آزمائیں تو ان کا ملت پر بڑا احسان ہوگا۔

مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق اور منصفانہ مطالبات سے دستبرداری کی دعوت دینا ہرگز منشا نہیں، ہمیں اختلاف اس طریقۂ کار، اس APPROACH اور ان اشخاص کی بے سوچی سمجھی جارحانہ وکالت سے ہے جو ملت کے مقدمہ کو کمزور کر دیتے ہیں، اور ان کے مسائل و مشکلات سے جُوا کھیل کر اپنے ذاتی اور جماعتی مقصد برآری کا کام لیتے ہیں۔

کسی مطالبہ کا تسلیم کرا لینا بھی کامیابی کی دلیل نہیں، اگر وہ مطالبہ ملت کے مستقبل کے لئے مہلک ہو۔

ہم اگر بے سوچے سمجھے کسی خطۂ زمین میں اپنی مملکت کا مطالبہ کر کے اس کے حصول میں کامیاب بھی ہو جائیں تب بھی ہمارے مسائل حل نہیں ہوں گے بلکہ ان میں مزید پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی۔ مسلم سیاست اس حقیقی اور تلخ تجربہ سے گذر رہی ہے، کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ بازی ہارنے کے لئے نہیں بلکہ پانے کے لئے واحد نمائندگی کے حصار سے نکل کر جذباتی سطح اور ذاتی و جماعتی اغراض سے بلند ہو کر ہم غور و فکر کریں اور باہمی مشورہ سے ملت کے مطالبات و مسائل کی وکالت کریں؟

تصاویر: سرورق اوپر مسجد دار العلوم ندوۃ العلماء کا اندرونی دالان
نیچے، مولانا سید سلیمان ندوی سے موسوم سلیمانیہ ہوسٹل کا ایک منظر جس میں طلبۂ دار العلوم۔
ٹائیٹل پشت پر، اوپر مہمان خانہ دار العلوم۔ نیچے، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام

اسلام اور عصر حاضر کے تقاضے

۳۰، شبلی روڈ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۱۱ اپریل ۱۹۸۸ء

محترم ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ "تعمیر حیات" کا خاص نمبر ملا۔ اس عنایت کا بہت بہت شکریہ۔ "اسلام اور عصر حاضر کے تقاضے" کے عنوان سے ایک مختصر مضمون "تعمیر حیات" کے لئے ارسال کر رہی ہوں۔ امید ہے پسند آئے گا۔ "تعمیر حیات" کی کسی قریبی اشاعت میں اس کو شائع کر کے ممنون ہونے کا موقع عنایت فرمایئے۔

والسلام

(ڈاکٹر) انجمن آرا انجم

★

ہر دور میں انسان مسائل سے دوچار رہا ہے۔ جیسے جیسے انسانی تمدن کا قافلہ آگے بڑھتا جاتا ہے انسان کی ضرورتوں میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے اور جوں جوں اس کے علم و عقل کے دائرہ کار میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے اس کے مسائل بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ ہر آنے والے دور کو گذشتہ دور کے مقابلے میں کچھ زیادہ اور نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ذہن انسانی کی ترقی، علوم کے ذخیرے اور دنیا کی تیز رفتاری کے ساتھ ساتھ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق مسائل کا سلسلہ بھی دراز ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اسی کے ساتھ ہر دور میں مفکرین اور ارباب حل و عقد پیش آمدہ مسائل کے حل کی کوششیں اور تدبیریں اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق کرتے رہے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔

آج کا دور بھی پچھلے ادوار کی بہ نسبت بہت سے نئے مسائل، پیچیدگیاں اور الجھنیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ یورپ کے صنعتی انقلاب، سائنسی علوم کی وسعت اور ہمہ گیر مقبولیت اور سماجی علوم کی ترقی نے انسانی ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ نئے نئے رجحانات، خیالات اور نظریات وجود میں آئے ہیں۔ فکر انسانی نئے سانچوں میں ڈھلی ہے۔ سوچ کے انداز بدلے ہیں۔ زندگی کے مسائل کا حل کبھی معاشیات کے اصولوں میں تلاش کیا گیا، کبھی نفسیاتی عوامل پر ان کی بنیاد رکھی گئی اور کبھی سائنس کی ترقی کو واحد مداوا سمجھا گیا۔ ایک بات ان سب میں مشترک رہی وہ یہ کہ مسائل کے حل کی جتنی صورتیں نکالی گئیں وہ خالصتاً مادہ پرستانہ نقطۂ نظر پر مبنی رہیں۔ یہی وجہ تھی کہ زمانے کے اس عظیم انقلاب اور مختلف مکاتب فکر کا نتیجہ یہ بنا کہ مذہب بنا اور اسے انسانی زندگی کی ترقی اور فلاح و بہبود میں زبردست رکاوٹ سمجھا جانے لگا۔ مذہب یا تو انفرادی حد یا ذاتی دائرے تک محدود ہو کر رہ گیا یا قطعی طور پر اس سے دامن کشی اختیار کر لی گئی۔ مذہب سے بیزاری کی اس لہر نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور نتیجتاً دنیا کا ایک بڑا طبقہ روحانیت سے اپنا رشتہ توڑ کر مادہ پرستی کی روش پر چل پڑا۔ عالم اسلام بھی نئے افکار و نظریات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا بلکہ سچ پوچھئے تو جدید رجحانات اور نظامہائے زندگی، دوسرے مذاہب کی بہ نسبت اسلام کے لئے کہیں زیادہ زبردست چیلنج ثابت ہوئے اور آج بھی ہیں کیونکہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو چند عقائد اور عبادات کا مجموعہ نہ ہو کر ایک مکمل طرز حیات ہے اور وہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق واضح اصولی اور بعض اوقات تفصیلی ہدایات لے کر آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اسلام کو مختلف چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا اور ہمیشہ ہی داعیان دین اور اکابر اسلام ان کے جوابات دیتے رہے ہیں۔ آج بھی اسلام کے سامنے زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق مختلف طرح کے چیلنج ہیں جو کبھی مخالفین اسلام کی طرف سے آتے ہیں اور کبھی خود مسلمان ہی اپنے مذہب کی کوتاہ دامانی کی شکایت کرتے نظر آتے ہیں اور برابر یہ سننے میں آتا رہتا ہے کہ اس تغیر پذیر سماج نیز نظام زندگی اور سائنس اور ٹکنالوجی کے ترقی یافتہ دور میں اسلام انسانی مسائل کا حل پیش کرنے سے قاصر ہے۔ دور حاضر کا یہ چیلنج کوئی معمولی چیلنج نہیں۔ اسلام کو اس سے بڑا اور کیا چیلنج دیا جا سکتا ہے۔ اب یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ پیش آنے والے مسائل سے آنکھیں بند کر لی جائیں اور اگر ایسا کیا گیا تو نقصان کسی اور کا نہیں بلکہ اپنا، اپنی ملت، اپنی قوم اور اپنے مذہب کا ہوگا۔ اس لئے عالم اسلام اور ملت اسلامیہ پر یہ اہم فرض عائد ہوتا ہے کہ عہد جدید کی اس چنوتی کا جواب دنیا کے سامنے اس طرح رکھے کہ جو نہ صرف نظریاتی طور پر بلکہ عملی طور پر قابل قبول ہو اور اسلام انسانی رہنمائی اور رہبری کا کام بہترین طریقے سے انجام دے سکے۔ اس کے علاوہ آج دنیا جس روحانی کرب اور ذہنی انتشار میں مبتلا ہے اور جس اخلاقی بے راہ روی اور نظریاتی بحران کا شکار ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مختلف علوم و فنون اور مختلف نظریات زندگی میں اسلام کی برتری اور اس کا عملی رخ ایسے مدلل اور علمی انداز میں پیش کیا جائے جو دنیا کے بھٹکے ہوئے انسانوں کے ذہنوں کو تشکیک کی راہ سے ہٹا کر ایمان و یقین کی دولت سے مالا مال کر سکے۔

سوال یہ ہے کہ وقت کی اس اہم ضرورت کو پورا کرنے اور اس جدوجہد کو عملی جامہ پہنانے اور اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے کیا صورتیں اور کوششیں ہونی چاہئیں۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ بنیادی ضرورت ایسے لوگوں کو تیار کرنے کی ہے جو اس کام کو سرانجام دے سکیں۔ اس کوشش کا پہلا قدم یہ ہو سکتا ہے کہ ملت اسلامیہ میں ایسے ممتاز، بلند پایہ اور اسلام کی بے لوث خدمت کرنے والے اشخاص کو چھانٹنے کی کوشش کی جائے جو ایک طرف علوم اسلامیہ پر گہری نظر رکھتے ہوں اور دوسری طرف علوم جدیدہ سے انہیں خاصی واقفیت ہو۔ اس عظیم کام کا بوجھ اٹھا سکنے کے قابل اور صحیح سمتوں میں رہنمائی کا حق ادا کرنے کے لائق ایسے ہی لوگ ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ دینی مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے والے ایسے ذہین اور حوصلہ مند طلبہ کو منتخب کیا جائے جو اسلام اور عہد حاضر کے مسائل سے خاصی دلچسپی رکھتے ہوں۔ یہ کوشش کی جائے کہ مدارس کے باصلاحیت طلبہ مغربی علوم و افکار اور ان کی بنیادوں سے واقف ہو سکیں۔ یہ عدم واقفیت دیکھا ہے کہ بسا اوقات ان لوگوں کے کاموں میں بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے جو بصورت دیگر علوم شرعیہ سے ماہرانہ واقفیت رکھتے ہیں۔ دوسری طرف خصوصاً ان یونیورسٹیوں میں جہاں علوم اسلامیہ، دینیات اور عربی زبان و ادب کی تعلیم کا معقول انتظام ہے توجہ کرنا چاہئے کہ شرعی اور دینی علوم کی نہ صرف تعلیم بلکہ تحقیقی مہارت کا اچھا نظم ہو ورنہ بالعموم تو یونیورسٹی سے نکلے ہوئے طلبہ مغربی زبانوں اور دوسرے علوم کی جانکاری چاہے رکھتے ہوں مگر علم دین سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں۔

اس کے ساتھ یہ بھی ضرورت ہے کہ ایسے طلبہ کے لئے چاہے وہ مدارس سے متعلق ہوں یا یونیورسٹیوں سے معقول مالی امداد کا انتظام کیا جائے تاکہ وہ یکسوئی سے خود کو اس تیاری میں مصروف رکھ سکیں۔ معاشی پریشانیاں اور زندگی کی ذمہ داریاں اچھے خاصے مخلص، باصلاحیت اور خدمت دین کا جذبہ رکھنے والوں کو بعض اوقات اس اصل مقصد کے حصول سے باز رکھتا ہے۔ بعض روزی کے بنیادی مسئلے میں الجھ کر ایسے باصلاحیت افراد کا ضائع ہو جانا ملت اسلامیہ کا سب سے بڑا خسارہ ہے۔

مغربی ممالک میں تو مشنری ادارے اس طرح کے فرائض جس منظم پیمانے پر اور بڑی ہمدردی کے ساتھ انجام دیتے ہیں مگر بدقسمتی سے ہمارے ملک ہندوستان میں کچھ تو مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی کی وجہ سے اور کچھ ارباب ثروت کی بے اعتنائی کی بنا پر اس طرح کے ادارے نہیں پائے جاتے۔ دوسری جگہ یہ ضرورت کسے ارباب خیر کو ادھر متوجہ کرنا ہی پڑے گا۔ اوقاف کو بھی دیکھنا چاہئے کہ وہ اس ذمہ داری میں کہاں تک ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ رابطہ عالم اسلامی بھی خاص حد تک اس معاملے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے اور ایسے نظم کے ذریعہ یہ فرض ادا کر سکتا ہے۔

یہ بھی ایک اہم سوال ہے کہ ایسے طلبہ کس نیاز سے کام کریں۔ نظم کس ادارے کے سپرد ہو جائے۔ خیال میں یہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

مولانا آزاد کے خلاف بہتان تراشی

محترمی! سلام

مولانا آزاد سے متعلق مسٹر متھائی کی بہتان تراشی کو بے نقاب کر رہا ہوں۔ جناب مناسب سمجھیں تو منسلکہ مضمون کو شائع کر دیں ورنہ واپس بھیج دینے کی عنایت فرمائیں۔ کوئی خدمت

نیاز مند جمنا داس اختر

(پنڈت جواہر لال نہرو کے سابق سکریٹری مسٹر متھائی کا یہ الزام سراسر بے بنیاد ہے کہ کیبنٹ مشن کی آمد پر مولانا آزاد نے وائسرائے کو کوئی خفیہ خط لکھا تھا۔ اور یہ کہ اسی مفروضہ خط کی بنا پر مہاتما گاندھی کی ہدایت کے مطابق مولانا آزاد کو انٹرم گورنمنٹ میں شامل نہیں کیا گیا۔ مندرجہ ذیل میں واضح دستاویزات سے اس الزام کو جھٹلایا گیا ہے)۔

از: جمنا داس اختر

پنڈت جواہر لال نہرو کے سابق سکریٹری مسٹر متھائی نے اپنی کتاب میں جہاں کئی دوسری شخصیتوں کے متعلق غلط بیانیاں کی ہیں وہاں مرحوم مولانا آزاد کی ذات پر حملہ کر کے ان پر سراسر بے بنیاد اور لغو الزامات لگائے ہیں۔ مثال کے طور پر مسٹر متھائی نے لکھا ہے کہ مولانا آزاد نے مہاتما گاندھی اور کانگریس سے بالا بالا کیبنٹ مشن کو ایک خط لکھ دیا تھا جس میں فرقہ وار مسئلہ حل کرنے کے لیے ایک ایسی اسکیم پیش کی گئی جو کانگریس کے نظریات کے منافی تھی۔

مسٹر متھائی نے مزید لکھا ہے کہ مسٹر سدھیر گھوش کو وائسرائے نے یہ بات بتائی۔ مسٹر گھوش نے یہ چٹھی مہاتما جی کو دی۔ یہ چٹھی مہاتما جی کی میز پر دھری تھی کہ مولانا آزاد پہنچے۔ مہاتما جی کے دریافت کرنے پر مولانا نے کہا کہ میں نے ایسی کوئی چٹھی نہیں لکھی۔ مہاتما جی کو اس سے بہت صدمہ ہوا اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ انٹرم گورنمنٹ میں مولانا آزاد کو نہیں لیا گیا۔

بہتان تراشی:

مسٹر متھائی کا یہ الزام سراسر بے بنیاد اور شر انگیز ہے۔ مولانا آزاد نے کیبنٹ مشن کو یا وائسرائے کو کوئی ایسا خط نہیں لکھا تھا۔ دراصل مولانا نے یہ خط مہاتما گاندھی کو لکھا تھا۔ مگر بدقسمتی سے سی۔ آئی۔ ڈی والوں نے اسے ڈاک خانے سے اڑا لیا تھا۔

اس بات کی تصدیق برٹش گورنمنٹ کی اپنی تصنیف "اختیارات کا انتقال جلد ۶ (۱۹۷۶)" سے واضح طور پر ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کے صفحات ۱۵۰-۱۵۵ پر یہ خط خاص طور پر درج ہے اور اس کے دیباچہ کے طور پر تھا کہ ۹ اگست ۱۹۴۵ء کو وائسرائے کے سکریٹری مسٹر جنکنز نے دوسرے سکریٹری مسٹر ایبل [illegible] کو ایک نہایت اہم خفیہ تار بھیجا تھا۔ یہ تار حسب ذیل تھا۔

"آزاد نے ۷ اگست کو گاندھی کو ہندو مسلم مجوزہ کی ایک اسکیم دو ایک خط کی صورت میں بھیجی تھی جس کے اس لفافے ہوئے خط کی ایک نقل میں نے ابھی دیکھی ہے۔ اس اسکیم کے ساتھ اپنے خط میں آزاد نے لکھا ہے کہ کانگریس کو مسلمانوں کے خدشات دور کرنے کے طریقے ڈھونڈھنے چاہییں۔ اور مسلمانوں کے سوال پر ایسی پالیسی اختیار کرنی چاہیے وہ دیکھیں مولانا سمجھتے ہیں کہ کسی قومی کمیٹی کا قیام مناسب ہوگا مگر ابتدا اس سے ہو کہ کانگریس سے باہر تمام مسلم جماعتوں کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو منظم کریں اور مستقبل کے آئین پر کوئی فیصلہ کریں۔ کانگریس اس فیصلہ کو قبول کرے اور ان مسلمان تنظیموں کے ساتھ اس پر مضبوطی سے قائم رہے۔ آزاد نے اس کے ساتھ اپنا میمورنڈم شامل کیا ہے اور لکھا ہے کہ میرے اپنے خیالات ہیں۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ یہ خط انہوں نے ذاتی حیثیت میں لکھا ہے نہ کہ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے۔"

۲۔ اس میمورنڈم کے تمہیدی پیراگراف میں فرقہ واریت کی موجودگی کا اعتراف کیا گیا ہے۔ اس میں وجہ ہے کہ اس کے اسباب پر بحث کرنا اور اس کے لیے کسی کو قصوروار قرار دینا بے کار ہے۔ مسلمان خوفزدہ ہیں اور ان کے خدشات اسی صورت میں دور ہو سکتے ہیں کہ کوئی ایسی اسکیم مرتب کی جائے جس کے تحت وہ سلامتی محسوس کریں۔ یونیٹری گورنمنٹ قائم کرنے کی کوئی بھی کوشش ناکام ہوگی۔ تقسیم وطن بھی ناکام ہوگی۔ اور یہ مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہے۔ ایک ہندوستانی مسلمان کی حیثیت سے آزاد تقسیم وطن کو شکست خوردگی کی پالیسی سمجھتے ہیں اور قبول نہیں کر سکتے۔

مولانا کی اسکیم:

اس کے بعد مولانا کی اسکیم کا سرسری خاکہ دیا گیا ہے۔

۱۔ ہندوستان کے مستقبل کا آئین فیڈرل ہونا چاہیے۔ اس کے یونٹ مکمل طور پر خود مختار (AUTONOMOUS) ہونے چاہییں۔ اس آئین میں مرکز کو کل ہند نوعیت کے ہی اختیارات ملنے چاہییں۔ یہ اختیارات وہ ہوں جن پر فیڈریشن میں شامل ہونے والے یونٹ اتفاق کریں۔

۲۔ ان یونٹوں کو علاحدگی کا اختیار دیا جائے۔

۳۔ مرکز اور صوبوں میں مشترکہ نیابت ہو۔ مختلف فرقوں کو آبادی کی بنا پر نیابت دی جائے۔

۴۔ مرکزی قانون ساز مجلس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو اس وقت تک مساوی نمائندگی دی جائے جب تک کہ فرقہ وارانہ شبہات دور نہیں ہو جاتے اور اقتصادی اور سیاسی لائنوں پر جماعتیں قائم نہیں کی جاتیں۔

۵۔ یہ روایت قائم کی جائے کہ ابتدائی مرحلہ میں انڈین فیڈریشن کا سربراہ باری باری سے ہندو اور مسلمان مقرر ہو۔

مضبوط مرکز کی ضرورت نہیں:

مسٹر جنکنز کے تار کے مطابق اس اسکیم پر مولانا آزاد کے میمورنڈم میں درج ہے کہ اتحاد کے لیے مضبوط مرکز کے ضروری ہونے کی دلیل درست نہیں۔ اس کا ثبوت سوویت یونین سے ملتا ہے۔ صوبوں میں غالباً ہندو اور مسلمان دونوں مشترکہ نیابت منظور کریں گے کیونکہ اکثریتی فرقہ کو اس سے کوئی اندیشہ نہیں ہونا چاہیے کہ اقلیتی فرقہ اکثریت کے فیصلہ پر اثر انداز ہو سکے گا۔ مرکز میں مسلمان مشترکہ نیابت سے شاید خوف زدہ ہوں۔ مگر مرکزی مجلس قانون ساز اور ایگزیکیٹو میں مساوی نمائندگی اور صوبوں کو علاحدگی کا اختیار مل جانے کے بعد ان کے خدشات بے بنیاد ہو جائیں گے۔ آزاد کو یقین ہے کہ سنجیدگی سے غور کرنے پر مسلمان اس اسکیم کو قبول کریں گے۔

۵۔ تار کے مطابق میمورنڈم کے آخری پیرا میں ہندوؤں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ ہندوستان کے مستقبل کے آئین میں مسلمانوں کے حصے کا فیصلہ مسلمانوں پر چھوڑ دیں۔ اگر مسلمانوں کو اس بات کی تسلی ہو جائے کہ ان پر کوئی غیر مسلم ایجنسی اپنا فیصلہ نہیں ٹھونسے گی تو وہ تقسیم کا مطالبہ ترک کر دیں گے اور محسوس کریں گے کہ فیڈرل اور متحدہ ہندوستان میں ان کے مفاد کی بہترین حفاظت ہوگی۔ جب ہندوستانیوں کو اقتدار حاصل ہو جائے گا، اقتصادی، سیاسی اور طبقاتی مفادات فرقہ وارانہ مفادات پر غالب آ جائیں گے۔"

برٹش گورنمنٹ کی اس دستاویز سے واضح ہو جاتا ہے کہ مسٹر متھائی کا یہ الزام سراسر بے بنیاد ہے کہ مولانا آزاد نے وائسرائے کو کوئی خط لکھا تھا۔ دراصل انہوں نے مہاتما گاندھی کو خط لکھا تھا جسے سی۔ آئی۔ ڈی نے راستے میں ہی اڑا لیا تھا۔

دوسرے الزام کی اصلیت:

مسٹر متھائی کا یہ الزام بھی سراسر بے بنیاد ہے کہ مہاتما گاندھی وائسرائے کے نام مولانا آزاد کے مفروضہ خط کی بنا پر ناراض تھے۔ اسی لیے انٹرم گورنمنٹ میں مولانا آزاد کو شامل نہیں کیا گیا۔ اس الزام کی تردید سردار ولبھ بھائی پٹیل [illegible] کی تازہ ترین کتاب "سردار کے خطوط - زیادہ تر غیر معروف" جلد اول کے صفحات ۱۴۱-۱۴۲ پر درج مہاتما گاندھی کے نام سردار پٹیل کے ایک خط سے واضح طور پر ہو جاتی ہے۔ یہ خط سردار پٹیل نے ۱۰ اگست ۱۹۴۶ء کو نئی دہلی سے لکھا تھا۔ ابھی انٹرم گورنمنٹ قائم نہیں ہوئی تھی۔ سردار پٹیل نے اس خط میں مجوزہ گورنمنٹ میں مسلمانوں کی نمائندگی کے سوال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ:

"ہمیں ابھی پانچ مسلمان اراکین کی فہرست تیار کرنا باقی ہے۔ ہم نے اس سوال پر بار بار غور کیا اور مسٹر آصف علی، مسٹر شفاعت علی، علی ظہیر اور فضل الحق کے ناموں کا فیصلہ کیا ہے۔ اب صرف ایک نام پر فیصلہ کرنا باقی ہے۔"

آصف کے معاملہ میں بھی قطعی فیصلہ ان کی منظوری پر ہوگا۔ اس طرح سے مولانا کا کام حسب معمول ٹھیک رہا ہے۔ اگر آج اور کل کوئی اور تبدیلی ہوئی تو حیرانی نہیں ہوگی۔ ایک اور واقعہ بھی ہوا ہے۔ مولانا ابھی فیصلہ نہیں کر سکے کہ وہ ممبر کی حیثیت سے شامل ہوں یا نہ ہوں۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ "میں پانچ مسلمان اراکین میں سے ایک کی حیثیت سے شامل نہیں ہوں گا۔ کیا مجھے کانگریس کے کوٹے سے نہیں لیا جانا چاہئے لیکن اس سے اتفاق نہیں کیونکہ اس سے نئے مسائل پیدا ہوں گے میں نے ان سے التجا کی ہے کہ وہ اس معاملہ پر دوبارہ غور کریں مگر وہ جواب دیتے رہے۔" تو میں حکومت میں شامل ہونے کے بجائے کانگریس کے صدر کی حیثیت سے زیادہ اہل ہوں گا۔ جیسا کہ کہا۔" آپ کی صحت خراب ہے اور اس کے باوجود وہ بھی راگنی الاپتے ہیں۔ یہ مسئلہ ہمارے سامنے سوالیہ نشان کی طرح آئے گا۔"

سردار پٹیل کے اس خط ان کے لب و لہجہ سے واضح ہوتا ہے کہ سردار پٹیل مولانا آزاد کو انٹریم گورنمنٹ میں لانے کے اصولی طور پر خلاف نہیں تھے۔ مگر وہ چاہتے تھے کہ مولانا کو مسلمانوں کے ایک نمائندہ کی حیثیت سے لایا جائے۔ جب کہ صدر کانگریس کی حیثیت سے اور کانگریس کے سیکولرازم کے مفاد کی حفاظت کے لئے مولانا چاہتے تھے کہ وہ ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسرے تمام فرقوں کی نمائندگی کریں۔ ظاہر ہے کہ سردار پٹیل اس معاملہ کو فرقہ وارانہ ہندو اور مسلمان کے نقطہ نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔

مولانا آزاد خالص ہندوستانی اور صدر کانگریس کی حیثیت سے اس مسئلہ کو حل کرنا چاہتے تھے۔

اس خط کی موجودگی میں یہ کہنا کہ وائسرائے کے نام مولانا کے مفروضہ خط کی وجہ سے مہاتما گاندھی مولانا آزاد سے ناراض ہو گئے تھے، اور اس بناء پر انہیں انٹریم گورنمنٹ میں نہیں لیا گیا سراسر بے بنیاد ہے۔ مذکورہ بالا حقائق مسٹر جھا کی اس بہتان تراشی کو جھٹلاتے ہیں۔ مولانا آزاد نے وائسرائے کو یقیناً کوئی خط نہیں لکھا تھا۔ انہوں نے سردار پٹیل کی فرقہ وارانہ روش کے پیش نظر انٹریم گورنمنٹ میں شرکت نہیں کی تھی۔ اگر مہاتما گاندھی مولانا آزاد کے خلاف ہوتے تو آزاد ہندوستان کی پہلی وزارت میں مولانا آزاد نامزد نہ کئے جاتے۔

مولانا عبدالماجد —— حیات و خدمات

مولانا عبدالماجد دریابادی کے متعلق بیانات و مضامین کا مجموعہ۔ شائع کردہ عبدالماجد اکاڈمی جس کی آمدنی مولانا مرحوم کی یادگار پر کے تمام پر صرف ہوگی۔ قیمت ۵ روپیہ قیمت کے ساتھ محصول ڈاک ۲ روپیہ مد پیشگی ارسال کی جائے۔

وی۔ پی میں محصول تین روپیہ سے بھی زیادہ پڑ جاتا ہے۔

عبدالماجد اکاڈمی۔ ۸۔ کچہری روڈ۔ لکھنؤ

بقیہ صفحہ ۳ کا: انڈونیشیا میں مقامی گرجا گھروں کے منتظمین نے عالمی کلیساؤں کی کونسل سے بھی سازباز کر رکھی ہے۔ کلیساؤں کی یہ عالمی کونسل ملک میں تعینات پادریوں کو ہر قسم کی مدد فراہم کرتی ہے اور تبلیغ طریقہ کار کے لئے حکمت عملی بھی وضع کرتی ہے۔ علاوہ ازیں ملک کی خبر رساں ایجنسیوں نے بھی اس عالمی کونسل سے مستحکم اور مربوط ہونے پر معاہدہ کر رکھا ہے۔

خلیج کی ویز خبر رساں ایجنسیوں نے انڈونیشیا میں عیسائیت کے روز افزوں بڑھتے ہوئے رجحانات کو سیلاب کی صورت سے تعبیر کیا ہے جو صرف انڈونیشیا تک ہی محدود نہ رہے گا بلکہ عدم تدارک کی صورت میں تمام اسلامی ممالک کو لپیٹ میں لے لے گا۔

اس وقت عالم اسلام کی زبوں حالی اور اپنے وطن میں جلاوطنی زبان حال سے ملت کو تجدید فکر و عمل کی دعوت دے رہی ہے۔ دیکھئے کتنی سعید و حساس روحیں اسلامی حمیت اور دینی غیرت سے سرشار ہو کر اس صدا پر لبیک کہتی ہیں۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

(علامہ اقبال)

اے گنبدِ خضرا کے مکیں

فرید تنویر۔ ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ آرک۔ نائب ناظم
شعبہ عربی و فارسی کتبات محکمہ آثار قدیمہ، ناگپور

کملی والے تری عظمت پہ زمانہ ہے نثار
تو کہ ہے ختم رسل ہادی نوع انساں
تو نہ آتا تو ہر اک سمت اندھیرا ہوتا
تو کہ ہے نور خدا، مظہر شان یزداں

نام احمد وہ مبارک ہے ترا کیا کہیے
اہل ایماں کے لئے باعث تسکین حیات
ورد ہو جس کا یہ اخلاص ہی شام و سحر
میرا ایماں ہے ملے اس کو ہر اک غم سے نجات

ترے فیضانِ محبت کی ضیا پاشی سے
میرے افکار کو ایمان کی تنویر ملی
میرے اشعار میں پیدا ہوا ساز و آہنگ
میرے خوابوں کو اک انمول سی تعبیر ملی

کملی والے! مرے آقا تجھے کیا نذر کروں
چند آہیں فقط اس سینۂ غمناک میں ہیں
چند نالے ہیں زباں پر تری الفت کی قسم
چند آنسو ہیں جو اس دیدۂ نمناک میں ہیں

تیرا خورشید کرم گر ہو درخشاں پھر سے
صفحۂ دہر سے مٹ جائے یہ ظلمت کا نظام
پھر ہو رحمت کی نظر رحمت عالم سب پر
اے شہ کون و مکاں تجھ پہ درود اور سلام

اسے ضرور پڑھیں!

جن حضرات پر "تعمیر حیات" کے چندہ کے بقایا جات ہیں ان کو خطوط بھیجے جا چکے ہیں۔ بعض حضرات نے چار چار سال سے چندہ نہیں ارسال فرمایا جب کہ پرچہ ان کو برابر جاری رہا۔ خط کی اطلاع کے مطابق اگلا پرچہ جملہ بقایا کے مطالبہ میں بذریعہ وی پی ارسال ہوگا۔

اگر آپ کا حساب خط کے مطابق نہ ہو تو فوراً اطلاع فرمائیں تاکہ حساب درست کیا جا سکے۔ جن حضرات کو خطوط مل چکے ہیں اور انہوں نے کوئی جواب ارسال نہیں فرمایا ہے وی پی وصول کرنا ان کا اخلاقی فرض ہے۔

(منیجر)

مغرب کے نظارے

> جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، ہم ان کو بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے۔ (القرآن)

امریکہ میں
فی منٹ دو طلاقیں ہوتی ہیں

امریکہ میں ہر سال زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اعداد و شمار شائع ہوتے ہیں۔ عام آدمی کے لئے ایک کتاب WORLD-ALMANAC شائع کی جاتی ہے جس میں یہ اعداد و شمار بڑے دلچسپ اور معلوماتی انداز میں دئے جاتے ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں امریکی معاشرے میں نکاح و طلاق کے بارے میں حسب ذیل اعداد دیئے گئے۔

"امریکہ میں ۱۹۷۷ء کی پہلی ششماہی میں ۹۸۰۰۰۰ شادیاں ہوئیں اور ۵۳۸۰۰۰ طلاقیں ہوئیں۔"

اندازہ کیا گیا ہے کہ،

"امریکہ میں ہر منٹ کے بعد دو طلاقیں ہوتی ہیں۔"

اہل تحقیق نے جائزے کے بعد پایا کہ امریکہ میں اول تو شادیوں کا تناسب کم ہو رہا ہے کیونکہ عورت اور مرد بغیر نکاح کے تعلقات قائم کر لیتے ہیں۔ لیکن جو نکاح ہو رہے ہیں ان کی تعداد طلاق کی تعداد کے برابر ہی رہتی ہے یعنی نکاح کا جو تناسب ہے طلاق کا تناسب اس سے کم نہیں ہے۔ امریکہ کے ایک مشہور شہر لاس اینجلز کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ،

"صرف ایک شہر لاس اینجلز میں ایک سال میں پچاس ہزار طلاقیں ہوئیں۔"

اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک پرچہ لکھتا ہے،

"۱۹۷۵ء کی پہلی ششماہی میں لاس اینجلز کی کونٹی میں نکاح سے زیادہ طلاق کے اجازت نامے جاری ہوئے یعنی شادیاں [illegible] ہوئیں اور طلاقیں ۸۳۷۵۔"

عورت مرد کے درمیان علاحدگی جس رفتار سے ہو رہی ہے یہ معاملہ امریکی اہل فکر کے لئے موجب تشویش ہو گیا ہے اور تعلقات میں زوال زیادہ شدت کے ساتھ پچھلے دس برس کی مدت میں آیا ہے۔

"پچھلے دس سال کی مدت میں امریکہ میں طلاق کی شرح دوگنی ہو گئی ہے ۱۹۶۵ء میں طلاقوں کی تعداد کل ۴۷۹۰۰۰ تھی لیکن ۱۹۷۵ء میں یہ بڑھ کر ۱۰۲۶۰۰۰ ہو گئی ہے۔"

بعض دوسرے مغربی ممالک میں علاحدگی کی یہ شرح اس سے بھی زیادہ ہے۔

"کینیڈا میں ۱۹۶۰ء میں طلاقوں کی کل تعداد ۶۹۸۰ تھی لیکن ۱۹۷۳ء میں یہ بڑھ کر ۳۶۷۰۴ ہو گئی۔ ۱۹۷۴ء میں اس میں اور ترقی ہوئی اور تعداد ۴۵۰۱۹ تک پہونچ گئی گویا ۱۹۷۳ء سے ۳۵ فیصد زیادہ۔"

کینیڈا کا معروف جریدہ اسٹار (ٹورنٹو) اس تشویشناک حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"چند برس قبل کی کامیاب شادیاں اب خواب معلوم ہوتی ہیں، جو جوڑے مہر و محبت کی زندگی بسر کر رہے ہیں وہ اب روز بروز اقلیت بنتے جا رہے ہیں۔"

سوویٹ روس میں بھی نکاح کے اعداد و شمار میں افسوسناک زوال دکھائی دیتا ہے۔ سوویٹ روس کا ڈائجسٹ SPUTNIK بتاتا ہے کہ،

"روس میں ہر سال ۲۵ لاکھ نکاح ہوتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی طلاق کا عمل بھی اسی رفتار سے جاری ہے۔ طلاقوں کی اوسط اب دو ہزار روزانہ تک پہنچ گئی ہے۔ گویا ہر تین شادیوں میں ایک شادی ناکام رہی۔"

برطانیہ میں بھی پچھلے عشرے میں طلاقوں کی شرح میں تیز تر اضافہ ہوا ہے۔

سویڈن کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ہر پانچ شادیوں میں اوسطاً دو کامیاب اور تین ناکام رہتی ہیں۔

ڈنمارک اور جرمنی میں طلاق کی شرح اس سے بھی زیادہ ہے۔

جب سے شادیوں میں ناکامی کی خبریں پھیلی ہیں تو اہل مغرب نے بجائے سبق حاصل کرنے اور اپنی اصلاح کی جانب توجہ کرنے کے اب بغیر نکاح کے رہنا شروع کر دیا ہے۔ امریکہ اور یورپ میں متعدد ایسے جوڑے ملتے ہیں جو بغیر نکاح کے رہتے ہیں۔ یعنی وہ ایک دوسرے سے اپنی خواہشات اس وقت تک پوری کرتے رہتے ہیں جب تک کام نکلتا ہے، جب گاڑی نہ چل سکی تو علاحدہ ہو گئے۔ اسے وہ TOGATHER LIVING کا نام دیتے ہیں لیکن اس کا تجزیہ آوارگی کی منظم شکل کے سوا اور کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ طرفہ یہ ہے کہ اکثر کہتے ہیں کہ یہ شکل روز بروز مقبول ہو رہی ہے۔

یہ بات ابھی سے بے نیاز یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ نفس کی پیروی ہی میں سکون ہے لیکن مغرب ہی کی تحقیق ہے کہ اہل مغرب کی ناخوشی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ امریکہ کے نفسیات سے متعلق ایک جریدے PSYCHOLOGY TODAY نے عورت مرد کے درمیان اس روز افزوں ناچاقی کے بارے میں لکھا ہے:

"ہم نے متعدد مطلقہ جوڑوں کو دیکھا ہے، ان میں ہم نے ایک بھی مرد ایسا نہیں پایا ہے جو علاحدگی کے بعد خوش ہو۔

جو شخص باہم مل کر رہنے کی صلاحیت سے عاری ہو جاتے ہیں وہ کسی کے ساتھ بھی مل کر نہیں رہ سکتے۔ بے نکاح زندگی نے عورتوں کو بالخصوص زیادہ ملول کیا ہے۔ ان بے نکاح لوگوں نے سوچا کہ صرف ضرورت پوری کرنے تک تعلقات کو محدود کرنے ہی سے خوشی حاصل ہوگی لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آدمی ہر قسم کی عزت نفس اور احساس خود اعتمادی سے محروم ہو کر رہ گیا۔"

ایک جائزے کے مطابق،

"یہ دیکھا گیا ہے کہ مطلقہ افراد میں خودکشی کا زیادہ رجحان ہے اور یہی لوگ ہیں جن کی اکثریت شراب خوری کی سخت عادی ہوتی ہے۔"

جو والدین ایک دوسرے سے علاحدگی اختیار کر لیتے ہیں ان کی اپنی زندگیاں جتنی تاریک ہو جاتی ہیں اس سے کہیں زیادہ ان کے بچے اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ طلاق کے بعد کوئی بھی ان کی نگرانی کی ذمہ داری لینے کو تیار نہیں ہوتا کہ ماں باپ کی محبت و شفقت کیا ہوتی ہے، گھر کیسے کہتے اور اس کا ماحول کیسا ہوتا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق اس وقت بھی امریکہ میں ایسے محروم بچوں کی تعداد کم از کم سوا کروڑ کے قریب ہے۔ ایک محقق خاتون نے جو ان بچوں کی زندگی کا جائزہ لے رہی ہے لکھا ہے:

"ہم ٹوٹے ہوئے گھروں کے ان بچوں کی ایک پوری نسل پیدا کر رہے ہیں۔ بچوں کی یہ نسل کسی روز سماجی ایٹم بم کی طرح اچانک پھٹے گی اور ہماری پوری سوسائٹی کو بھک سے اڑا دے گی۔"

بقیہ صفحہ ۲: اسلام اور عصر حاضر کے تقاضے

دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ ایسے تعلیمی مراکز اور تربیتی مراکز ہیں جو اگر اس معاملے میں اشتراک کریں تو ہمارے طلبہ کی شخصیتوں کے دونوں رخوں کی تکمیل بڑے اچھے طریقے سے ہو سکتی ہے، دیکھئے کب یہ تعلیمی اور تربیتی مراکز وقت کی اس اہم ضرورت کی طرف توجہ دیتے ہیں اور اپنی اہم ذمہ داری کو نبھاتے ہیں جس کی توقع کرنی چاہئے کہ مستقبل قریب میں ہی انشاء اللہ۔

پرنٹر پبلشر مسئول سید محمد حسنی نے جے۔ کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر "تعمیر حیات" ندوہ لکھنؤ سے شائع کیا۔

ایڈیٹر: اسحٰق جلیس ندوی

انڈونیشیا

کو تیس سال کے اندر عیسائی ملک بنانے کی

حکومتی پیمانہ پر ایک منظم سازش

عزیز الرحمٰن کانپوری۔ متعلم درجہ ہشتم عربی

اگرچہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک بابر مذہب کے سلسلے میں عدم مداخلت اور بے تعصب ہونے کا اعلان کر رہے ہیں لیکن ان ممالک کی حالیہ سرگرمیوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کا یہ نعرہ محض دھوکا اور فریب ہے۔ آج بھی عیسائی مشنریز بر اعظم ایشیا میں انتہائی ترقی یافتہ عالم نما غیر مذہبی ممالک کے اشاروں پر اور ان کی مالی و اخلاقی امداد کے بل بوتے پر عیسائیت کی تبلیغ کر رہی ہیں اور مسلم معاشرے کو روز بروز کمزور کرتی چلی جا رہی ہیں۔ بدقسمتی سے بیشتر مسلم ممالک جو داخلی اور خارجی حیثیت سے سیاسی کشمکش میں گرفتار ہیں، مذہب اسلام کے خلاف اس نفسیاتی اور سرد جنگ کو دیکھنے سے معذور ہیں لیکن حالیہ جائزہ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ بعض مسلم ممالک نے ان عیسائی مبلغین کی تنظیموں کے خطرناک عزائم کو بھانپ لیا ہے۔

چنانچہ ایک عربی رسالے کے بقول خلیجی ممالک اور دیگر عرب ممالک نے عیسائیت کے بڑھتے ہوئے خطرناک اثرات سے عالم اسلام کو آگاہ کیا اور انہوں نے مسلم ممالک سے اپیل کی ہے کہ وہ عیسائیت کے روز افزوں بڑھتے ہوئے اثرات کو جن جن کا صرف خلیجی ممالک ہی شکار نہیں رہے ہیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ مسلم ممالک کی غفلت سے یہ اثرات سارے عرب ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے لیں۔

تبلیغ کے باخبر سیاسی حلقوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی مشنریوں کی تمام تر توجہ کا مرکز فی الحال "انڈونیشیا" ہے جہاں وہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر ممکن کوشش کر رہی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ "انڈونیشیا" میں سرکاری سطح پر ایک ایسی تجویز پاس ہوئی ہے جس کی رو سے مسلمانوں کے اثرات کو کمل طور پر ختم نہیں کر کے عیسائیت کو عام فروغ دیا جائے۔ اس تجویز کا مقصد عیسائیت کی ترویج و اشاعت اور اسلامی اقدار کی تخریب و تنسیخ ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ مسلم ممالک نے عیسائیت کے بڑھتے ہوئے اثرات کو سمجھ لیا ہے کہ اگر اسلام کے خلاف ان تحریکوں کا سدباب نہ کیا گیا تو انڈونیشیا جلد ہی بیسویں صدی کا اسپین بن جائے گا جہاں کبھی مسلم معاشرہ برسراقتدار تھا جہاں قصر الحمراء اور قصر الزہراء اور مسجد قرطبہ جیسے اسلامی آثار و مراکز تھے اور اب صرف اس کی یاد چند دلوں میں تازہ ہے لیکن ان کے پاسبان رخصت ہو گئے، جہاں مسجدیں اذانوں اور نمازیوں سے محروم اور مدارس اپنے شاندار ماضی پر مرثیہ خواں ہیں۔

تبلیغی ممالک کے ایک ذمہ دار نے یہ اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ صرف تیس سال میں سرزمین انڈونیشیا سے مسلمان خدانخواستہ نیست و نابود ہو جائیں گے۔ کان اذانوں کو سننے کے لئے اور آنکھیں مسلمانوں کو دیکھنے کے لئے ترس جائیں گی۔ مسجدیں تو ہوں گی مگر نمازی نہ ہوں گے۔ مدرسے بھی ہوں گے مگر دینی علوم کے طالب علم نہ ہوں گے۔ مسلمانوں کے ختم کرنے کے لئے جو اسکیم بنائی گئی ہے اس کا ۳۰ سال میں نفاذ ہو جائے گا۔ جس کے نفاذ کے لئے حکومت نے مختلف مقامات پر گورنر، فوج اور پولیس کے افسران اور سی آئی ڈی جاسوسوں کو مقرر کیا ہے جو اس خطرناک اسکیم کو پوری جسارت اور حکمت عملی کے ساتھ بروئے کار لا رہے ہیں۔ عیسائیت کو پھیلانے کی تحریک عوامی سطح سے نکل کر اب حکومت کی سطح تک آگئی ہے چنانچہ حال ہی میں ملک کے طول و عرض میں عیسائی مبلغوں کا ایک جال بچھا دیا گیا ہے، ان چار غالی عیسائی مبلغوں کو حکومت کے اہم عہدوں پر مقرر کیا گیا ہے۔

۱۔ جنرل ہارون یارجن۔ وزیر امور سلامتی و سیاست

۲۔ ڈاکٹر سومرلین۔ وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ

۳۔ سوہان سوسیا انکورات۔ وزیر صحت

۴۔ رادولکس سراد بینی۔ وزیر تجارت

اس کے علاوہ ملک کے اہم حساس شعبوں مثلاً عدالتوں میں دفتروں اور پاسپورٹ آفسوں میں تجارتی مراکز، فوجی چھاؤنیوں، اور اقتصادی و ثقافتی انجمنوں میں ان عیسائی مشنریوں اور عیسائیت کے علمبرداروں کا اثر و رسوخ بڑھتا جا رہا ہے۔ حکومت کے چند کلیدی عہدوں پر تو ان کا مکمل کنٹرول ہو چکا ہے جن اعلیٰ مناصب پر عیسائیوں کو مقرر کیا گیا ان کے نام اور عہدے حسب ذیل ہیں۔

۱۔ میجر جنرل بینی مورداني۔ وزارت دفاع محکمہ جاسوسی کا سربراہ۔

۲۔ میجر جنرل یونی شہزادہ۔ فوج میں سپلائی کا انچارج

۳۔ لفٹننٹ جنرل ودودی یوروی دار مادہ۔ پولیس آئی۔ جی

۴۔ میجر جنرل رشیا مشتری۔ وزارت دفاع قومی سلامتی آئین کمیٹی کا سربراہ۔

۵۔ میجر جنرل ۔ بشیر ۔ جاکرتا کی پولیس کا فوجی کمانڈر۔

۶۔ میجر جنرل بیرودیسہ۔ بحری فوج کے منصوبہ ساز شعبہ کا سربراہ۔

۷۔ اندرورو۔ سیاسی جاسوسی کے مرکزی محکمہ کا سربراہ۔

۸۔ بریگیڈیر جنرل تان بونان۔ فوجی ٹریننگ کالج کا پرنسپل۔

۹۔ یوصرالی سوردا سور۔ بوم انگار اور پولیس کا سربراہ۔

تبلیغ عیسائیت کی اس مہم میں غیر ملکی کمپنیاں بھی بھرپور دلچسپی لے رہی ہیں اور انڈونیشیا میں اپنے پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے میں شب و روز مصروف ہیں۔

مبصرین کے نزدیک اس کے کچھ سیاسی اسباب ہیں جن میں ایک صدر سوکارنو کا زوال اور صدر سوہارتو کا ملک کے سیاسی افق پر نمودار ہونا ہے۔ صدر سوکارنو کے زوال اور صدر سوہارتو کے برسراقتدار آنے پر عوام و خواص میں جو بے چینی اور گڑبڑیاں بھی ہوئیں جن کی صدائے بازگشت ملک میں اب بھی باقی ہے۔ صدر سوہارتو کی عیسائی بیوی بھی ان بے چینیوں اور گڑبڑیوں سے بیگانہ نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ صدر سوہارتو کی کامیابی بڑی حد تک ان کی عیسائی بیوی کی حکمت اور کرشموں کی مرہون منت ہے، اس کو بلاشبہ جدید انقلاب کا قائد کہا جا سکتا ہے۔

تصویر کا یہ رخ تو سیاسی تھا تصویر کا دوسرا رخ خالص مذہبی ہے جس کے پس منظر میں ملک کی وہ عیسائی انجمنیں ہیں جو بہ ظاہر عیسائیت کی تبلیغ میں اور عیسائی مراکز کے قیام میں کوشاں ہیں، ان انجمنوں کو ملکی و غیر ملکی عیسائیوں کی پوری پشت پناہی اور مدد حاصل ہے۔ عیسائیت کے نقوش کو عوام و خواص کے دلوں و دماغوں پر ثبت کرنے کے لئے عیسائی مشنریاں بڑے پیمانے پر سماجی خدمات کا اہتمام کرتی ہیں۔ وہ پادری جن کا تعلق یورپی نسل سے ہے ملک میں ان کی تعداد تقریباً سات ہزار بتائی جاتی ہے۔ اس پر بس نہیں بلکہ اب تو مسجدوں، مدرسوں اور خانقاہوں کے شانہ بشانہ گرجا گھر اور کلیسا بھی بڑی تعداد میں تعمیر کئے جا چکے ہیں جن سے ملک میں عیسائیت کے فروغ کو بڑی مدد مل رہی ہے۔ یہ تنظیمیں جدید آلات و وسائل اور طریقۂ کار سے لیس ہیں۔ جب کہ مسلم مبلغین اپنے پرانے طرز پر گامزن ہیں اور مالی حیثیت سے کمزور۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ پورے ملک کے مختلف اداروں، تعلیم گاہوں، زراعتی اور صنعتی مراکز اور ریڈیو اسٹیشنوں اور ہسپتالوں میں ان پادریوں کے اثرات گہرے ہوتے جا رہے ہیں جہاں سے وہ مسیحیت کی تبلیغ بلا روک ٹوک کر رہے ہیں، ملک کے مقبول روزناموں اور رسالوں، صحافت اور دوسرے نشر و اشاعت کے ذرائع بھی استعمال کر رہے ہیں بلکہ ملک کا ایک مقبول و محبوب ترین اخبار "روحیا سی" اور "سغار باربان" ان کے مکمل دست تصرف میں ہے، اس اخبار کی یومیہ اشاعت ڈیڑھ لاکھ ہے۔

خود صدر سوہارتو زہد باطنی سے تعلق رکھتے ہیں ان کی اہلیہ دین مسیح کی شیدائی ہیں اور جان و مال سے مسیحیت کی تبلیغ کر رہی ہیں جس کی وجہ سے پورا ملک مسیحیت کے دام میں آ چکا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود عیسائیوں کی تعداد انڈونیشیا کے مسلمانوں کے بالمقابل بہت کم ہے۔ حکومت کے کلیدی عہدوں پر ان کا تناسب بہت زیادہ ہے، عیسائیت کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہونے کی وجہ سے عوام کے ذہنوں سے اسلام کے نقوش کم ہوتے جا رہے ہیں اور عیسائیت کی چھاپ گہری ہوتی جا رہی ہے، ذہنی طور پر عوام عیسائیت کو اسلام کے مقابلے میں برتری دینے لگے ہیں حال یہ ہے کہ اب ملک کے تین صوبوں کی حکومتوں پر عیسائیوں کا مکمل قبضہ ہے اور صرف ایک صوبہ کی قیادت ایک مسلمان کے تحت ہے۔

کہا جاتا ہے کہ انڈونیشیا کی وزارت داخلہ میں وہ ذمہ دار ہستی ہے جو دراصل عیسائی ہے جس کی ملک کی انتظامیہ پر سب سے زیادہ قوی و مضبوط گرفت ہے جس وقت چاہے ملک کے حالات پل بھر میں موڑ سکتی ہے، عوام کی باگ ڈور بھی اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہیں۔

تبلیغی ملکوں کے بالفرض [illegible] کا کہنا ہے

(باقی صفحہ ...)

مشرقی جرمنی

خاندانی منصوبہ بندی سے توبہ

دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں نے غریب اور ترقی پذیر ممالک کی اقتصادی خوشحالی کے لئے جو نسخے دریافت کئے ہیں ان میں ایک بہت مشہور نسخہ آبادی میں اضافے کی روک تھام ہے۔ [illegible] میں مشرقی جرمنی نے بھی اس نسخے پر عمل کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر یہ اس وقت ملک کی مجموعی آبادی [illegible] کی نسبت بہت کم تھی کیوں کہ تقریباً ۳۵ لاکھ افراد کمیونسٹ نظام سے تنگ آکر مغربی جرمنی میں منتقل ہو چکے تھے۔ نا ہر قومی معیشت باقی رہ جانے والوں کی کفالت کی بھی متحمل نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ نئے قانون نافذ کئے گئے۔ اسقاط کی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ ضبط ولادت کے سامان مفت فراہم کئے گئے۔ ان اقدامات کی بدولت مشرقی جرمنی میں شرح پیدائش یورپ میں سب سے کم ہو گئی لیکن پھر جلد ہی منصوبہ گر ماہرین کو ہوش آ گیا۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ آبادی میں تخفیف ملک کے معاشی مستقبل کو اور بھی مخدوش بنا دے گی چنانچہ [illegible] میں پہلا کام یہ کیا کہ عورتوں کو گھروں سے باہر نکل کر ملازمتیں حاصل کرنے کی ترغیب کے تمام پروگرام بند کر دیے گئے۔ اگرچہ اس وقت کارخانوں میں لیبر کی قلت تھی مگر عورتوں پر زور دیا گیا کہ وہ گھروں میں رہ کر اپنا فطری کردار ادا کریں بلکہ جو خواتین پہلے سے ملازمت کر رہی تھیں انہیں بھی افزائش نسل کی ترغیب دی گئی [illegible] میں ایک قانون کے ذریعے زچگی کی رخصت بڑھا کر [illegible] ہفتے کر دی گئی۔

مشرقی جرمنی میں محنت کشوں کے اوقات کار ہفتہ میں ۴۳ گھنٹے مقرر ہیں مگر پچھلے سال مئی میں دو یا دو سے زیادہ بچوں کی ماؤں کے اوقات گھٹا کر چالیس گھنٹے فی ہفتہ کر دیے گئے۔ حکومت ہر بچے کی پیدائش پر ماں کو ایک ہزار مارک کا عطیہ دیتی ہے اس کے علاوہ پہلے بچے کو بیس مارک ماہانہ وظیفہ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد بچے کی شرح بڑھتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ پانچویں بچے کو ستر مارک ماہانہ دیے جاتے ہیں۔

خواتین کو گھر میں رہنے کی ترغیب

یہ دراصل خاندانی منصوبہ بندی کے دو رخ ہیں جو قومی معیشت میں دور رس اثرات کا باعث بنیں گے۔

اس منصوبے کے تحت جوانوں کو کم عمری میں شادی کرنے کی بھی ترغیب دی جاتی ہے۔ ایک قانون کے تحت ۲۶ سال کی عمر تک کے بیاہتا جوڑوں کو پانچ ہزار مارک کا سود معاف قرضہ حکومت سے لینے کی اجازت ہے۔ تاکہ وہ اپنا گھر بسا سکیں۔ اس قرضے کی واپسی آٹھ سال میں کی جا سکتی ہے۔

اس اسکیم کے تحت حکومت اب تک تقریباً [illegible] ارب مارک کے قرضے جاری کر چکی ہے۔ اس قرضے میں ایک رعایت یہ بھی ہے کہ ہر بچے کی پیدائش پر اس کا ایک حصہ قرضے سے معاف کر دیا جاتا ہے اور جس گھر میں تین بچے پیدا ہو جائیں اس سے قرضے کی واپسی کا بالکل مطالبہ نہیں کیا جاتا اس سے پیدائش میں حیرت انگیز اضافہ ہو گیا ہے۔ [illegible] میں سالانہ شرح پیدائش ۱۰٫۸ فی ہزار تھی۔ جو یورپ میں سب سے نیچی شرح تھی۔ اس کے بعد نئی نسل کا ظہور شروع ہوا تو [illegible] میں [illegible] کی نسبت ۳۳ ہزار سات سو بچے زیادہ پیدا ہوئے اور پچھلے سال ماہرین کے تخمینے سے بھی ۲۷ ہزار ۲ سو بچے زیادہ پیدا ہوئے۔ اس طرح شرح پیدائش ۱۳٫۵ فی ہزار تک پہنچ گئی اس سال رفتار اور بڑھتی نظر آتی ہے کیوں کہ پہلی سہ ماہی میں [illegible] کی پہلی سہ ماہی کی نسبت پانچ ہزار زائد بچے پیدا ہوئے ہیں۔

مشرقی جرمنی کے لوگ اپنے اس کارنامے پر بہت نازاں ہیں، چنانچہ مغربی جرمنی کی حکومت بھی اب اسی طرح کے اقدامات پر غور کر رہی ہے کیوں کہ وہاں کی گرتی ہوئی شرح پیدائش نے ماہرین معاشیات کو فکر میں ڈال دیا ہے۔

روس میں اظہار رائے کی آزادی؟

ایک سائنسدان کو سزا

★

سوویت یونین کی ایک عدالت نے بند کمرے میں تین روز کی سماعت کے بعد ایک ایٹمی سائنسداں ڈاکٹر یوری اورلوف کو سات سال قید بامشقت اور مزید پانچ سال اندرون ملک جلا وطنی کی سزا سنائی ہے ان کا جرم یہ تھا کہ انہوں نے [illegible] کے معاہدہ ہیلسنکی کی روشنی میں جس پر سوویت یونین نے دستخط کئے تھے۔ روس میں انسانی حقوق کی پامالی کی طرف توجہ دلائی تھی ان پر سوویت قانون کے تحت ملک دشمنی کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ انہیں اور ان کے دو ساتھیوں کو گرفتار کر کے سال بھر سے زیادہ مقدمہ چلائے بغیر جیل میں رکھا گیا اور پھر اس مہینے کی پندرہ تاریخ کو اس انداز میں سماعت شروع کر دی گئی۔ تین دن میں سماعت مکمل کر کے سزا بھی سنا دی گئی۔ ان کی بیوی کو کمرۂ عدالت سے باہر جانے سے پہلے خفیہ پولیس کے مرد افسروں کے سامنے برہنہ کر کے تلاشی لی گئی۔

ادھر برطانوی دارالعوام کے چند ارکان نے اس نام نہاد مقدمے کے خلاف احتجاج کی ایک قرارداد کا نوٹس دیا ہے مگر ان محرکین میں [illegible] پارٹی کے وہ جوشیلے اور بیہودی ارکان شامل نہیں ہیں جنہوں نے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی رہائی کا مطالبہ کیا تھا۔

معاہدہ ہیلسنکی میں سوویت یونین سمیت مشرقی اور مغربی یورپ کے ممالک نے باہمی امن و مفاہمت کے ساتھ ساتھ یہ بھی طے کیا تھا کہ بنیادی انسانی حقوق کے عالمی منشور پر عمل درآمد کریں گے جس میں اظہار رائے اور حکومت پر تنقید کی آزادی بھی شامل ہے۔ اس کے بعد سے روس کے متعدد دانشوروں نے ان بنیادی حقوق کو استعمال کرنے کی کوشش کی مگر انہیں یا تو جیل جانا پڑا یا وطن چھوڑنا پڑا۔ ڈاکٹر اورلوف اور ان کے دو رفقاء الیگزانڈر گنزبرگ اور اناطولی شارانسکی نے [illegible] میں ایک گروپ قائم کیا جس نے سوویت یونین میں معاہدہ ہیلسنکی کی خلاف ورزی کے واقعات پر رپورٹیں مرتب کیں۔ یہ رپورٹیں غیر ملکی اخبار نویسوں اور سفیروں کو ارسال کی گئیں۔ اس پر ڈاکٹر اورلوف اور کچھ دن بعد ان کے دونوں ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان دونوں کے خلاف مقدمے کی سماعت کی ابھی تک نوبت نہیں آئی ہے۔

ڈاکٹر اورلوف کے خلاف بھی ۱۵ مئی کو جب مقدمے کی سماعت شروع ہوئی تو استغاثہ نے حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن اور پروپیگنڈے کا الزام عائد کیا۔ ڈاکٹر اورلوف نے اقبال جرم سے انکار کر دیا اور عدالت کی اس تجویز کو بھی مسترد کر دیا کہ وہ وکیل کے ذریعے اپنی صفائی پیش کریں۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنا مقدمہ خود لڑوں گا۔ جج کی کرسی پر ایک خاتون فروکشن تھیں انہوں نے ڈاکٹر اورلوف کے ہمدردوں اور غیر ملکی اخبار نویسوں کو عدالت میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔

عدالت سے باہر تقریباً دو سو افراد جمع تھے، جن میں نوبل انعام یافتہ ادیب آندرے سخاروف بھی شامل تھے۔ باہر پولیس کا سخت پہرہ تھا۔ ایک یورپی اخبار نویس نے پولیس افسر سے شکایت کی کہ غیر ملکی اخبار نویسوں کو تو اسٹالن کے زمانے میں بھی کمرۂ عدالت میں بیٹھنے کی اجازت مل جایا کرتی تھی اس پر پولیس افسر نے جواب دیا کہ اسٹالن کا زمانہ ہوتا تو آپ لوگ اس طرح یہاں کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔

سماعت کے دوسرے دن ڈاکٹر اورلوف نے اپنی صفائی میں گواہ پیش کرنے کی اجازت چاہی تو عدالت نے انکار کر دیا۔ تیسرے دن بھی یہی صورت رہی۔ آخر انہوں نے اپنا بیان شروع کیا۔ عدالت میں ایسے لوگ بٹھا دئے گئے تھے جو ان کی تقریر کے دوران آوازے کستے رہے اور ان کا مذاق اڑاتے رہے مسز اورلوف کا کہنا ہے کہ عدالت کی جج خاتون بھی بار بار مخالفانہ انداز میں ان کے شوہر کو ٹوکتی رہیں۔ آخری سماعت نو گھنٹے جاری رہی اور اس میں استغاثہ نے مطالبہ کیا کہ ملزم کو ملک دشمن پروپیگنڈے کے الزام میں سخت ترین سزا دی جائے فیصلے کا اعلان اگلے روز پر ملتوی کر دیا گیا۔ اور جب عدالت برخاست ہوئی تو خفیہ پولیس کا ایک افسر مسز اورلوف کی تلاشی لینے کے لئے بڑھا۔ ان کے نوجوان بیٹے نے اس پر مزاحمت کی تو اس کو زدوکوب کیا گیا اس کے بعد ایک خاتون افسر کو بلایا گیا اس نے مرد افسروں کے سامنے مسز اورلوف کے تمام کپڑے اتروا دیے اور اس طرح جامہ تلاشی ہو چکی تو انہیں باہر جانے کی اجازت دی گئی۔

[illegible]

از قاری محمد علی لکھی پوری

منی پور میں

اسلام اور مسلمان

قاری محمد علی صاحب (۱۱) فیض بازار مسجد گوہاٹی آسام نے ایک خط راقم کے نام لکھا تھا جس میں انھوں نے منی پوری مسلمانوں اور خاص طور پر منی پوری طلباء کے بارے میں مفید معلومات درج کیں۔ اس خط کا خلاصہ پیش ہے۔

عبد المجید ندوی آسامی

آج سے چودہ سو سال قبل جب کہ دنیا میں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی، ضلالت و گمراہی کا دور دورہ تھا۔ شرک و بت پرستی کا بازار گرم تھا، ظلم و زیادتی کی کثرت تھی۔ خرافات اور اوہام ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی، اور انسانیت کی اس ڈوبتی ہوئی کشتی کو بھنور سے نکال کر ساحل سے ہمکنار کرنے کے لئے وہ ہادی برحق کو مبعوث فرماتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ ہے کہ جب جب دنیا میں برائی عام ہوئی اس نے اس کی اصلاح کے لئے کسی نہ کسی نبی یا رسول کو بھیجا چنانچہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے خطۂ زمین میں مبعوث ہوئے جس کو قرآن نے "غیر ذی ذرع" فرمایا ہے لیکن اس غیر ذی زرع سے ایسا چشمہ ابلتا ہے جو بہت ہی مختصر مدت میں پوری دنیا کو سیراب کر دیتا ہے اور ایک صدی کے اندر اندر پوری دنیا کو اپنی روشنی سے منور کر دیتا ہے۔

پہلی صدی ہجری میں اسلام ہندوستان میں آیا، محمد بن قاسم ثقفی کے ہندوستان میں آمد سے پہلے ہی اس خطۂ زمین پر عرب تاجروں نے اسلام کی بنیاد ڈالنی شروع کر دی۔ مسلم دور حکومت میں دانشور طبقہ اور حکمراں طبقہ نے اشاعت اسلام کے سلسلہ میں کوئی خاص توجہ نہیں کی، پھر بھی صوفیائے کرام نے اسلام کی اشاعت کے سلسلہ میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی لیکن ہندوستان میں بعض ایسے خطے بھی تھے جو سولہویں صدی بیسویں تک اسلام سے مشرف نہ ہو سکے۔ آئیے آج آپ کو ایک ایسے ہی خطے کے بارے میں کچھ بتلائیں جس خطہ میں کم آپ نے نقشہ میں بار بار دیکھا ہوگا۔

منی پور کتنی ہی اس قوم کی شجاعت و بہادری کی داستانیں چرچا میں ہوں گی لیکن یہ کبھی نہ سنا ہوگا کہ اس خطۂ زمین میں قال اللہ و قال الرسول کی صدائیں کس طرح بلند ہوئیں۔ وہاں اسلام کیسے پہونچا۔ یہ خطۂ تو شمالی ہندوستان کا کوئی علاقہ ہے اور جنوبی ہند سے اس کا ربط ہے۔ ان علاقوں میں تو اسلام تقریباً پہلی صدی ہجری میں ہی پہونچ چکا تھا۔ جس خطہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں یہ ہندوستان کے انتہائی مشرق میں آسام کی پہاڑیوں میں بسا ہوا ہے، جس کے ایک طرف برما اور دوسری طرف آسام واقع ہے۔ اس خطہ کا جغرافیائی نام "منی پور" ہے۔

اس مضمون کے ذریعہ آپ کو اس بات سے روشناس کرانا چاہتا ہوں کہ منی پور میں اسلام کیسے آیا؟ اس کو کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اور آج وہاں مسلمانوں کی سیاسی سماجی اور تعلیمی حالت کیا ہے۔

اکبر کے دور حکومت میں جب کہ اسکی حکومت کشمیر سے لے کر کنیا کماری اور بنگال سے لے کر افغانستان تک پھیلی ہوئی تھی اس وقت بھی یہ خطہ مسلمانوں سے محروم تھا، اس زمانہ میں وہاں ایک خود مختار راجہ راج کرتا تھا، اس کے انتقال پر اس کے لڑکوں اور چچازاد بھائیوں کے درمیان اقتدار کی جنگ شروع ہوئی اور شاہ محمد ناظر کو جو اس زمانہ میں اکبر کی طرف سے بنگال کا گورنر تھا اس خطہ میں فوج کشی کرنے کا موقع ملا۔ منی پوری راجہ کے اندر مقابلہ کی طاقت نہ تھی پھر بھی اس نے حیلہ سے مسلمانوں سے ہتھیار ڈلوا لیا اور مسلمانوں کو قید کر لیا۔

لیکن مسلمانوں کے عادات و اطوار اور حسن اخلاق کو دیکھ کر وہ اتنا متاثر ہوا کہ سب کو آزاد کر دیا اور اپنے ملک میں رہنے کی اجازت دی اس سے اسلام کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا اور وہ صدا جو فاران کی چوٹیوں سے بلند ہوئی تھی اسکی بازگشت ہمالیہ کی آخری چوٹی پر سولہویں صدی میں سنائی پڑی اور اس علاقہ میں اسلام کا چشمۂ فیض جاری ہوا۔

علمی اور سیاسی اعتبار سے اگر جائزہ لیا جائے تو آج سے چند سال قبل تک منی پوری مسلمانوں کا کوئی اہم مقام نہیں تھا۔ سیاسی اعتبار سے آزادی کے بعد سے منی پوری مسلمانوں کی حالت بہتر ہوئی فی الحال وہاں کے کابینہ میں وزیر داخلہ محمد علیم الدین اور وزیر آبکاری محمد اشرف علی مسلمان وزراء شامل ہیں۔ اور وہاں چیف منسٹر بھی مسلمان رہ چکا ہے۔ علمی اعتبار سے یہ قوم آج سے چند سال قبل بالکل ہی پسماندہ تھی۔ پھر بھی بے شمار مصائب کو جھیل کر یہ قوم سولہویں صدی سے بیسویں صدی تک اسلام پر جمی رہی۔ جب کہ وہاں نہ تو شمالی ہند کی طرح علماء و فضلاء کی کثرت تھی اور نہ دار العلوم دیوبند، دار العلوم ندوۃ العلماء جیسے بین الاقوامی ادارے تھے پھر بھی منی پوری مسلمانوں کی تعداد روز بروز بڑھتی رہی اور آج تقریباً دو لاکھ مسلمان اپنے اسلامی عقیدے اور مذہب پر عمل پیرا ہیں۔

منی پوری مسلمانوں پر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اسلام کا نام لینا ان کے لئے دشوار ہو گیا۔ ایسے وقت میں ایک شخص پریشانیوں اور مصیبتوں کو برداشت کرتا ہوا آتر پردیش پہونچا اور چند سالوں میں اسلامی علوم سے مالامال ہو کر لوٹا اور اسلام کی تبلیغ کا کام دوبارہ شروع ہوا مسلمان نوجوان اسلامی علوم کی طرف راغب ہوئے۔ بہت سے نوجوان علوم دینیہ حاصل کرنے ہندوستان کے مختلف مدارس میں پھیل گئے۔

انہیں علماء و فضلاء کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج آسام کا سب سے بڑا دار العلوم بانسکنڈی ضلع کچھار جس نے تقریباً ایک صدی سے ترقی پایا ہے، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے شاگردوں میں ایک شخص جن کا نام حافظ اکبر علی تھا اور منی پوری مسلمان تھے مکہ و مدینہ کی بابرکت سرزمین میں حضرت امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ دس سال گذارنے کے بعد اپنے وطن واپس ہوئے اور بانسکنڈی کے حاجی عثمان صاحب دیرو کی اعانت سے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ مدرسہ چلتا رہا یہاں تک کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی آمد سے اس کے دور ثانی کا آغاز ہوا اور اس وقت سے یہ مدرسہ دار العلوم میں تبدیل ہو گیا اور آج یہ دار العلوم حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے خلیفہ رشید شیخ الحدیث مولانا احمد علی صاحب کی نظامت و رہنمائی میں روز افزوں ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور تقریباً چھ سو طلباء اسکی علوم سے مالامال ہو رہے ہیں۔

میرے لئے یہ بہت ہی ناانصافی بلکہ ناشکری کی بات ہوگی کہ میں اس بات کا ذکر نہ کروں اور شمالی ہند کے علماء کی کوششوں کو نظر انداز کر دوں۔ منی پوری مسلمانوں کو سچے معنوں میں مسلمان بنانے۔ دینی علوم کی طرف رغبت دلانے اور دینی فطرت پر جمے رہنے میں جو رول شمالی ہندوستان کے ان با کمال علماء و فضلاء اور بین الاقوامی اداروں نے ادا کیا ہے۔ اس کو ہم منی پوری مسلمان کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ صاف بات تو یہ ہے کہ اگر شمالی ہند نے اس زبوں حال قوم کی رہنمائی نہ کی ہوتی تو آج منی پور میں اسلام کا کلمہ پڑھنے والا شاید ہی کوئی نظر آتا۔

منی پوری مسلمانوں کے بنانے اور سنوارنے میں جتنا ہاتھ دار العلوم دیوبند، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مظاہر العلوم سہارنپور، مدرسہ امینیہ دہلی اور مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ کا ہے اس کو ہم منی پوری مسلمان کبھی بھلا نہیں سکتے۔

ہمیں اس کا بھی اعتراف ہے کہ بعض اوقات منی پوری طلباء نے ناواقفی اور جہالت کی وجہ سے بعض مدارس میں اپنے غلط صفات بھی دکھائے اور آپس میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوئے۔ ہم ان کی طرف سے ان اداروں کے ذمہ داروں سے معافی کے خواستگار ہیں۔ اور خاص طور پر حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند اور حضرت مولانا حافظ محمد زکریا صاحب مد ظلہ کی خدمت میں دست بستہ عرض کرتے ہیں کہ ان طلباء کی لغزشوں اور غلطیوں کو معاف فرمائیں اور امید کرتے ہیں کہ ان نادار طلباء کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ فرمائیں گے۔ آمین

خط و کتابت کرتے وقت اپنا پتہ صاف نمبر حوالہ خریداری ضرور تحریر کریں

(منیجر)

ندوۃ العلماء

منزل بہ منزل

قسط ۔۱

ندوۃ العلماء کا چوتھا اجلاس

منعقدہ میرٹھ

ندوۃ العلماء کا چوتھا اجلاس ۱۵، ۱۶، ۱۷ شوال ۱۳۱۳ھ مطابق ۳۱، ۳۲، ۳۳ مارچ ۱۸۹۶ء بروز جمعہ، شنبہ، یکشنبہ میرٹھ میں منعقد ہوا۔ مولانا محمد لطف اللہ صاحب مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد دکن نے صدارت کو رونق بخشی۔

کیسے کیسے صاحب کمال تھے

حضرت مولانا محمد لطف اللہ صاحب نے اپنے افتتاحیہ کلمات میں فرمایا۔

جانو بھائیو! آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کے اسلاف کیسے کیسے صاحب فضل و کمال تھے اور آپ کی قوم میں کیسے کیسے لوگ صاحب جاہ و جلال تھے، علم و ہنر میں یگانۂ روزگار تھے۔ شان و شوکت کی یہ کیفیت تھی کہ مخالفین کی نظروں میں صاحب عظمت و وقار تھے۔ افسوس زمانے نے ایسا پلٹا کھایا کہ اس تمام فضل و کمال کا نقش صفحۂ ہستی سے مٹا دیا، اب نہ وہ علم ہے نہ کمال بلکہ بجائے اس کے سراسر جہل ہے، اور جو حال زمانے کی حالت دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا کہ غالباً چند روز میں یہ گل کھلے گا کہ کوئی شخص فرائض وضو بتانے والا بھی نہ ملے گا مگر الحمد للہ کہ ایسے نازک وقت میں توفیق الٰہی نے ہمارے علماء دین کو خواب غفلت سے جگایا اور انہوں نے بحمد تعالیٰ اپنے ضمیر کا نیا زینہ استوار کرکے دکھایا۔ ندوۃ العلماء کی بنیاد ڈالی، ہدایت خلق اللہ کی حد و رہ نکالی، مقاصد اس کے سراسر ہدایت ہیں جن کو علمائے کرام نے جلسات سنین ماضیہ میں کمال فصاحت بیان فرمایا ہے۔

اس کے بعد سید محمد علی صاحب مونگیری ناظم ندوۃ العلماء کو سال گذشتہ کی کارروائی سنانا چاہئے تھی مگر چونکہ ناظم صاحب ممدوح اپنی علالت دائمی کی وجہ سے آواز بلند پڑھنے سے معذور تھے، اس لئے مولانا سید محمد عبدالحی صاحب مددگار ناظم نے کارروائی پیش کی اور جناب صدر انجمن کی اجازت سے پڑھ کر سنائی۔

خلاصۂ رپورٹ ناظم ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیریؒ

جناب صدر انجمن صاحب و اعیان جلسہ! قبل اس کے کہ میں حسب دستور سال گذشتہ کی مختصر کارروائی بیان کروں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ ندوۃ العلماء کو قائم ہوئے تین برس ہو چکے اس وقت سے اب تک اس کی نظامت کا فخر آپ نے مجھ کو بخشا ہے۔

اب میں سال گذشتہ کی مختصر کارروائی اور تجاویز منظور شدہ کی تعمیل یا عدم تعمیل کو بلا تصنع ظاہر کرتا ہوں۔

سالہائے پیوستہ کے جلسوں میں تین اہم تجویزیں منظور ہوئی تھیں (۱) ترتیب نصاب (۲) دارالافتاء (۳) فراہمی سرمایہ۔ ان تین تجویزوں کی جو کارروائی اس سال ہوئی ہے۔

ترتیب نصاب: یہ تجویز ندوے کے دیباچے کا آغاز ہے اور شاید ہمارے احباب کو اس بات پر سخت تعجب ہے کہ باوجود کئی سال کی متواتر کوششوں کے اب تک نصاب تیار نہیں ہوا اور خود مجھ کو بھی اس کی کارروائی ظاہر کرنے میں بجز اظہار معذرت کے اور کوئی چارہ نہیں۔

بیشک باوجود متواتر کوششوں کے نصاب اب تک تیار نہیں مگر یہ کام ایسا سہل بھی نہیں ہے جیسا ہمارے دوستوں نے خیال کر لیا ہے۔ معمولی کتابوں میں رد و بدل کر دینا بلاشبہ آسان ہے مگر ان ضروریات کے لحاظ سے نصاب کرنا جن کو ہمارے علماء نے اپنی متعدد تقریروں میں ظاہر کیا ہے دشوار اور سخت تر دشوار ہے تاہم اب تک جو کام اس ضعیف و ناتواں کے کرنے کا تھا وہ اپنے و سیع خیالی کے بموجب کیا۔

دارالافتاء: اس سال اس کے متعلق کی سرمایہ کی وجہ سے کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔

فراہمی سرمایہ: یہ تجویز ہے جس پر ندوے کی تمام کارروائیوں کا دارومدار ہے بلکہ اس عالم اسباب میں دین و دنیا کے اکثر کام بڑے سے لے کر چھوٹے تک بغیر اس کے نہیں ہو سکتے چہ جائیکہ ندوے کی وہ تجویزیں جن میں صرف کثیر کی ضرورت ہے اس کے متعلق ارکان ندوہ نے کوئی خاص کارروائی نہیں کی جس سے وہ عظیم الشان تجویزیں عملی قالب میں لائی جاتیں جن پر مسلمانوں کی بہبود کا مدار ہے۔

سال گذشتہ کے جلسۂ سالانہ میں دو تجویزیں منظور ہوئی تھیں۔ تقرر واعظین برائے اشاعت اسلام اور قیام دارالعلوم، مگر افسوس ہے کہ اس سال ان تجویزوں کے متعلق کوئی کارروائی نہیں ہو سکی جس کی بڑی وجہ تو یہی ہے کہ ندوے کے پاس اس قدر سرمایہ نہیں ہے کہ وہ ان تجویزوں کو عمل میں لائے، دوسری وجہ یہ بھی ہوئی کہ اس مختلف وجوہ سے اپنے وقتوں پر جلسہ انتظامیہ نہیں ہو سکے اس وجہ سے سرمایہ جمع کرنے کی خاطر خواہ تحریک نہیں ہوئی ورنہ ہم کو امید تھی کہ اہل اسلام ان کاموں کے لئے جو سراسر انہیں کی بہبودی کے ہیں اور جن کو خاص و عام نے مفید تسلیم کر لیا ہے ضرور توجہ کرتے۔ تیسری وجہ قحط و طاعون بھی ہوئی کہ ایک عالم کی پریشانی دیکھ کر چندہ کی کوشش کرنے میں تامل رہا۔

۱، ۲، ۳ جمادی الاخریٰ کو ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں بقیہ کارروائی جلسۂ سالانہ کی مثل اصلاح دستور العمل و انتخاب ارکان وغیرہ کی گئی اور مندرجہ ذیل تجویزیں منظور ہوئیں۔

۱۔ تجویز یہ منظور ہوئی کہ ندوہ کی منظور شدہ تجویزوں میں سے جو کام شروع کیا جائے وہ وسیع پیمانے پر ہو، اور انجمنوں و مجلسوں کے کاموں سے ممتاز ہو۔

۲۔ یہ بھی طے ہوا کہ دارالعلوم کے قائم کرنے کے لئے ایک علیحدہ مجلس قائم کی جائے اور اس کے لئے جداگانہ دستور العمل مرتب ہو۔

اس تجویز کے موافق مولوی شبلی صاحب نعمانی کو تکلیف دی گئی کہ وہ اس مجلس کے قواعد مرتب کرے۔

دوسرا جلسہ ۱۹ رجب ۱۳۱۳ھ کو منعقد ہوا اس میں بعض ضروری امور طے ہوئے۔

ندوۃ العلماء کے مقاصد کی اشاعت

اس سال پنجاب اور پورب کے مشہور شہروں میں ندوۃ العلماء کے اغراض اور مقاصد کی تائید و اعانت کی غرض سے مجلسہائے ماتحت قائم ہو گئی ہیں جو چند دنوں کے بعد انشاء اللہ مفید تر ثابت ہوں گی۔

۱۔ معین ندوۃ العلماء دہلی۔ یہ انجمن مولانا ابو محمد عبدالحق صاحب مصنف تفسیر حقانی اور مولوی حافظ عزیز الدین صاحب وکیل دہلی کی کوشش سے قائم ہوئی۔

۲۔ معین الندوہ کرنال۔ مولوی حافظ عزیز الدین صاحب وکیل دہلی کی تحریک سے قائم ہوئی اور رؤسائے کرنال نہایت دلاویزی سے اس میں شریک ہوئے۔

۳۔ مستشار العلماء لاہور۔ مولوی تاج الدین صاحب مختار چیف کورٹ پنجاب نے انجمن خادم علوم اسلامیہ کے جلسۂ سالانہ میں اس کی تحریک کی اور باتفاق آراء منظور ہوئی۔

۴۔ معین الندوہ ریواڑی۔ ریواڑی ضلع گڑگاؤں میں حافظ عزیز الدین صاحب وکیل کی کوشش سے قائم ہوئی اور وہاں کے معززین اس کے ارکان اور عہدہ دار مقرر ہوئے۔

۵۔ معین الندوہ غازی پور۔ مولوی عثمان خاں صاحب وکیل کی تحریک اور مولوی عبدالصمد صاحب وکیل کی تائید سے قائم ہوئی۔

۶۔ معین الندوہ پٹنہ، یہ انجمن رؤسائے شہر کے اتفاق سے قائم ہوئی۔

۷۔ معین الندوہ بانکی پور، خان بہادر مولوی سید فضل امام صاحب کی تحریک اور مولوی سید شرف الدین صاحب بیرسٹر ایٹ لا کی تائید سے قائم ہوئی۔

حضرات! اسلام اور اہل اسلام کے لئے یہ وقت بہت نازک ہے۔ ندوۃ العلماء سے اس کی بہبودی میں جہاں تک ہو سکتا ہے نہایت سعی و جد کوشش کرتا ہے اگر خدائے تعالیٰ کو اس کی بہبودی منظور ہے تو اس کے مقاصد پورے ہو کر رہیں گے۔ ورنہ جو ہمارا فرض ہے اسے ہم ادا کرتے ہیں۔

السعی منی والاتمام من اللہ

(باقی)

Regd No. LW/NP 58

Phone- 22948
29747

TAMEER-E-HAYAT

Fortnightly

(NADWATUL-ULAMA LUCKNOW-226007 (INDIA)